دعوتِ دین

مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل

''دعوتِ دین کی اہمیت ،فرضیت ،اس کے فضائل و منافع ،خاص کر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے دعوت کے فوائد اور فقہی پہلو سے دین میں دعوت کا مقام نیز دعوتِ دین کے لئے موجودہ زمانہ میں اہم وسائل پر بصیرت افروز و مدلل گفتگو اور مسلمانانِ ہند کے لئے ایک رہنما تحریر''

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر

سنٹر فار پیس اینڈ ٹرو میسیج ،چادرگھاٹ ،حیدرآباد (انڈیا)

طبع اول ۱۴۳۰ھ — ۲۰۰۹ء

نام کتاب : دعوتِ دین — مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل
مصنف : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
صفحات : ۶۴
کمپیوٹر کتابت : محمد نصیر عالم سبیلی (**العالم** اُردو کمپیوٹر سنٹر، حیدرآباد)
فون نمبر : **9959897621, 9396518670**
قیمت :

ناشر

سنٹر فار پیس اینڈ ٹرو میسیج، چادر گھاٹ، حیدرآباد (انڈیا)

ملنے کے پتے

- المعہد العالی الاسلامی تعلیم آباد، قبا کالونی، شاہین نگر، حیدرآباد
- سنٹر فار پیس اینڈ ٹرو میسیج، چادر گھاٹ، حیدرآباد
- کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور (یوپی)
- دکن ٹریڈرس، مغلپورہ، نزد پانی کی ٹنکی، حیدرآباد
- ہندوستان پیپر ایمپوریم، مچھلی کمان، حیدرآباد

فہرست مضامین

☆ ☆ ☆ ☆

عرضِ ناشر

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اپنے آخری رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں پیدا فرمایا اور اپنی ہدایت سے نوازا اور یہ بھی اس کا کرم ہے کہ اس نے ہمیں ہندوستان جیسے عظیم اور تاریخی ورثہ کے حامل ملک میں بسایا ؛ کیوں کہ دعوت کا آغاز ہندوستان سے ہوا اور یہ اپنی آخری و مکمل صورت میں حجاز مقدس میں اُتارا گیا، گویا ان دونوں علاقوں کو اسلام اور دین قیم سے ایک نسبت حاصل ہے، ہندوستان اگر اس کا مبداء ہے تو حجاز مقدس اس کا منتہی ؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر اُتارے گئے، ویدوں میں بھی حضرت آدم وحوا کا ذکر ملتا ہے۔

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ سے اس ملک میں مقیم ہونے کے باوجود ہم نے اس سرزمین کے باشندوں تک اللہ کے دین کو پہنچانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی اور گویا ہم ان کے ساتھ حق تلفی کے مرتکب ہوئے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ کچھ عرصہ سے اس سلسلہ میں تھوڑی بہت کوشش شروع ہوئی ہے، اسی کا ایک حصہ ''سنٹر فار پیس اینڈ ٹرو میسیج، حیدرآباد ہے'' اس سنٹر کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ممتاز عالم دین اور فقیہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ کی سرپرستی میں قائم ہے اور اس کی ساری جدوجہد علماء کرام کے زیر سایہ انجام پاتی ہیں، اس لئے اُمید ہے کہ انشاء اللہ یہ ادارہ صراط مستقیم سے کبھی منحرف نہیں ہوگا۔

چوں کہ غیر مسلم بھائیوں میں دعوت کے کام کی طرف طویل عرصہ سے ہم غافل رہے، دوسری طرف مسلمانوں کے خلاف عالمی سطح پر یہودی وعیسائی طاقتوں کے معاندانہ

رویہ اور خود ہندوستان میں فرقہ پرست طاقتوں کی زیادتیوں کی وجہ سے ان کے بارے میں مسلمانوں کے اندر بھی نفرت کے جذبات پرورش پانے لگے، حالاں کہ داعی کے لئے ضروری ہے کہ اس کا دل مدعو کی محبت سے معمور ہو، اس لئے ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی، جو علمی طور پر دعوت کی اہمیت کو اُجاگر کرتی اور اس سلسلہ میں شکوک وشبہات کو دور کرتی ہو — بحمد اللہ مولانا رحمانی مدظلہ نے اس کی طرف توجہ فرمائی اور دعوت کی اہمیت اور اس کے فوائد کی وضاحت، نیز اس سلسلہ میں شکوک وشبہات کے ازالہ کے لئے یہ کتاب تالیف کی، جو یوں تو سبھوں کے لئے مفید ہے، مگر خاص کر علماء اور خواص کو انشاءاللہ اس سے بڑا فائدہ پہنچے گا۔

ہم اس سلسلہ میں مولانا محترم کا بہت بہت شکریہ ادا کرتے ہیں اور سنٹر کی طرف سے اس کی اشاعت اجازت دینے پر بھی ممنون ہیں، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اُمت پر تادیر مولانا محترم کا سایہ قائم رکھے اور اس کتاب سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچے، آمین یا رب العالمین۔

ڈاکٹر سید عبدالرشید
(نائب صدر سنٹر)

☆ ☆ ☆ ☆

پیش لفظ

نحمده ونصلی علی رسولہ الکریم . اما بعد !
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً . (البقرۃ:۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے تم مسلمانوں کو ایک اُمت وسط بنایا؛ تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

یہ آیت دراصل اُمتِ محمد یہ کی امامت کا اعلان ہے؛ کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو ہدایت سے نوازا ہے اور اسے سیدھی راہ عطا کی گئی ہے؛ اسی لئے اس کو اُمتِ وسط قرار دیا گیا ہے؛ چنانچہ روزِ محشر رسولِ اکرم ﷺ گواہی دیں گے کہ آپ نے توحید و رسالت اور آخرت کا پیغام اور عملِ صالح کا نمونہ بہ حیثیت پیغمبر بے کم و کاست اُمت کو پہنچا دیا ہے اور عملاً اسے نافذ بھی کر دیا ہے، حجۃ الوداع میں آپ نے واضح طور پر اُمت سے اس کی گواہی لی اور ان سے عہد لیا کہ وہ اسے دوسروں تک پہنچاتے رہیں گے؛ چوں کہ آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں اور نبوت کا سلسلہ آپ پر ختم ہو چکا ہے؛ اس لئے دعوتِ دین کی یہ ذمہ داری اللہ کی طرف سے اُمت مسلمہ پر عائد کی گئی ہے اور اسے قیامت میں اس بات کی گواہی دینی پڑے گی کہ اس نے یہ دعوت اللہ کے دوسرے بندوں تک پہنچا دی ہے"**وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا**" (البقرۃ:۱۴۳) —— غرض کہ اُمت کو امامت کے جس مقام پر سرفراز کیا گیا ہے، وہ اس کے لئے اعزاز بھی ہے اور ذمہ داری بھی، اور اگر اس نے اس میں کوتاہی سے کام لیا، تو وہ عند اللہ جواب دِہ بھی ہوگی۔

محترم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ نے مسلمانوں کی اس اہم ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے "سنٹر فار پیس اینڈ ٹرو میسیج، حیدرآباد" کو قائم کیا اور اس کی سرپرستی قبول فرمائی،

اس راستہ پر کام کرنے کے لئے لٹریچر اور مشوروں کی ضرورت ہے، ہندوستان میں موجودہ مختلف زبانوں اور تہذیبوں کا مطالعہ ضروری ہے، افراد کی تیاری اور دعوتی کام کے لئے ذہنوں کی تربیت سب سے بڑا چیلنج ہے، طبقاتی نظام میں منقسم یہ سماج مسلمانوں کا ایسا کردار اور رویہ دیکھنا چاہتا ہے، جو ان کے لئے بہترین نمونہ بن سکے، اس لئے ضروری تھا کہ ایسے تمام نکات وعناوین کو جمع کیا جائے، جو مسلمانوں کے ذہنوں میں دعوت کے کام کی اہمیت کو اُجاگر کرسکیں اور ان تمام عام و خاص سوالات کا جواب دے سکیں جو داعی اور مدعو کے دل میں چبھنے والے شکوک وشبہات کے کانٹوں کو نکال سکیں، واقعہ ہے کہ مولانا کی یہ کتاب اختصار کے باوجود اس مقصد کو پورا کرنے کی نہایت اہم اور کامیاب کوشش ہے!

دعوتِ دین کا وجوب اور اُمت پر اس کا فرض ہونا اللہ تعالیٰ کے رحمان و رحیم ہونے اور رسول اللہ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کا لازمی تقاضہ ہے، اللہ کی رحمت کا تقاضہ ہے کہ انسان کے لئے آخرت کی نجات کی صورت پیدا ہو اور حضور ﷺ پر ختم نبوت کا تقاضہ ہے کہ جو گروہ آپ کے پیغام کا حامل ہے، وہ اب فلاح ونجات کے راستہ کی رہنمائی کرے، مولانا محترم نے اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ فریضۂ دعوت سے غفلت کی وجہ سے دُعائیں رد کردی جاتی ہیں اور مومن اللہ کی مدد سے محروم ہوجاتا ہے، آپ نے دعوت کے فرضِ عین یا فرضِ کفایہ ہونے پر فقیہانہ بحث کرتے ہوئے ایک مدلل موقف اختیار کیا ہے، آپ فرماتے ہیں: ''فرضِ کفایہ ہونے کا مقصد یہ ہے کہ اس کام میں اتنے لوگ لگ جائیں، جو اس کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے کافی ہوں'' ٹکنالوجی کی ترقی کے اس دور میں یقیناً اُمتِ مسلمہ کے لئے یہ ایک دعوتِ فکر ہے!

مولانا نے خاص طور پر غیر مسلم ممالک میں دعوتِ دین کی اہمیت وضرورت پر بڑی ہی عالمانہ اور چشم کشا گفتگو کی ہے، جس میں اسلامی تعلیمات کی بہترین ترجمانی بھی ہے اور اعتدال و توازن بھی، آپ نے واضح کیا ہے کہ جمہوری ممالک میں عام طور پر جہاد اور ہجرت کی شرطیں نہیں پائی جاتیں؛ لہٰذا مسلمان اقلیتوں کے لئے صرف دعوت کا راستہ رہ جاتا ہے اور یہی اصل مقصود ہے، آپ نے یہ بھی واضح کردیا ہے کہ اگر دشمن مسلمانوں کی جان ومال، عزت وآبرو پر حملہ آور ہوں، تو پھر دفاع ہر مسلمان کا فریضہ بن جاتا ہے۔

آپ نے غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اصلی دعوت ایمان کی ہے نہ کہ فروعی واختلافی مسائل کی، اور دعوت کے اصل مخاطب کفار ہیں نہ کہ مسلمان، تاہم مسلمانوں میں بھی دعوت واصلاح کے کام کی اہمیت ضرور ہے، آپ نے دعوت کے طریقۂ کار کو بھی واضح فرمایا ہے، جو اس راہ کے مسافروں کے لئے بہترین زادِراہ ہے، اس میں دعوتی تربیت، دعوتی لٹریچر کی تیاری، الکٹرانک میڈیا کا استعمال، خدمتِ خلق اور غیر مسلم برادرانِ وطن سے بہترین تعلقات کو فروغ دینا شامل ہے۔

میں اپنی بے بضاعتی اور علم وعمل کی کوتاہی سے اچھی طرح واقف ہوں؛ مگر جب مولانا محترم نے بذاتِ خود اس کتاب پر پیش لفظ لکھنے کا حکم فرمایا تو تعمیل حکم کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں رہا، یہ اس حقیر کے لئے ایک بہت بڑی آزمائش تھی، مولانا کی کتاب اللہ، سنتِ رسول اور فقہ اسلامی پر مبنی مدلل بحث پر تبصرہ کرنے کی جسارت یہ احقر کہاں سے لاتا، ہاں! اسے سمجھنے کی کوشش ضرور کی ہے، غیر مسلموں میں دعوت کو لے کر جو سوالات مسلمانوں کے ذہنوں میں اُٹھتے ہیں، ان کے جوابات کی تلاش ایک عرصہ سے تھی، انشاء اللہ اس کمی کو یہ کتاب اچھی طرح پوری کرے گی، — ''سنٹر فار پیس اینڈ ٹرو میسیج، حیدرآباد'' کے تحت اس کتاب کی اشاعت یقیناً اس کے مقصد کو تقویت پہنچائے گی اور خاص کر اہل علم اور مخلصین کے دلوں میں شکوک وشبہات کے کچھ کانٹے چبھتے ہوں تو ان کے لئے یہ بہت مفید اور چشم کشا ثابت ہوگی، انشاء اللہ۔

اللہ تعالیٰ سے دُعاء ہے کہ مولانا کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور 'سنٹر فار پیس اینڈ ٹرو میسیج' کی مدد کرے کہ وہ اس اہم کام کو انجام دے سکے اور اس کے خدام عنداللہ اجر کے مستحق ہوں، آمین۔ **وما توفیقی الا باللہ.**

احقر

اقبال احمد انجینئر

(صدر سنٹر فار پیس اینڈ ٹرو میسیج)

۱۶؍صفر ۱۴۳۰ھ

۱۲؍فروری ۲۰۰۹ء

☆ ☆ ☆ ☆

حرفِ چند

اس وقت پوری دنیا میں مسلمان نہایت تکلیف دہ حالات سے گذر رہے ہیں، خونِ مسلم کی ارزانی ہر صاحب ایمان کو خون کے آنسو رلاتی اور تڑپاتی ہے، دُعاؤں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے، ایک طبقہ اپنی طاقت بھر دشمنانِ اسلام سے مزاحمت میں بھی جان و مال کی بازی لگائے ہوا ہے؛ لیکن اس کے باوجود حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہیں آتی اور اُمتِ مسلمہ کی مظلومیت کی شب تاریک دراز سے دراز تر ہوتی جارہی ہے، اس کے کیا اسباب ہیں؟ اس پر سیاسی، فوجی، معاشی اور سماجی پہلوؤں سے عصر حاضر کے علماء، دانشور مسلسل غور بھی کررہے ہیں اور اظہار خیال بھی۔

لیکن بحیثیت مسلمان کوئی بھی مسئلہ ہو، ضروری ہے کہ ہم اس پر کتاب وسنت کی روشنی میں غور کریں اور اللہ اور اس کے رسول کی ہدایات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا محاسبہ کریں؛ کیوں کہ ہم خدا کے غیبی نظام پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے غیبی نظام کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ جیسے خدا نے حیوانات اور نباتات و جمادات میں تاثیر رکھی ہے، مختلف جانوروں کے گوشت کے الگ الگ اثرات ہوتے ہیں، مختلف نباتات انسان میں الگ الگ نوع کی کیفیت پیدا کرتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کے اعمال میں بھی تاثیر رکھی ہے، نماز کی اپنی تاثیر ہے، روزہ کا اپنا اثر ہے، وغیر ذالک، اسی طرح دعوت الی اللہ کا اثر ''**عصمت من الناس** ''(مائدۃ:٦٧) یعنی ''لوگوں سے تحفظ'' کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اس لئے جب تک یہ اُمت اللہ کے بندوں تک اللہ کے دین کو پہنچانے کی ویسی ہی بلیغ کوشش نہیں کرے گی، جو اپنے اپنے عہد میں اللہ کے پیغمبروں نے کیا ہے، تب تک وہ اس محرومی ومقہوری سے باہر نہیں آسکے گی، جس سے اس وقت دوچار ہے۔

دعوتِ دین سے متعلق اس مختصر تحریر میں اسی پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس تحریر کا محرک یہ ہوا کہ ''رابطہ عالم اسلامی'' نے اپنے زیر اہتمام منعقدہ نویں مکہ کانفرنس مؤرخہ: ۲ تا ۴ ذوالحجہ ۱۴۲۹ھ مطابق ۱ تا ۳ ڈسمبر ۲۰۰۸ء بمقام رابطہ بلڈنگ مکہ مکرمہ میں اس حقیر کو شرکت کرنے اور ''دعوتِ دین کی اہمیت وضرورت'' پر مقالہ لکھنے کی دعوت دی، اس پوری کانفرنس کا موضوع ''**التعریف بالاسلام والاقلیات المسلمة ...... الواقع والمامول** '' تھا، چنانچہ راقم الحروف نے کانفرنس کے پہلے اجلاس منعقدہ مؤرخہ: ۳؍ذوالحجہ کو بعد نماز مغرب اپنا مقالہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی، معروف صاحب علم ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے، رابطہ کے موجودہ جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی بھی موجود تھے، اتنا وقت تو نہیں تھا کہ پورا مقالہ پیش کیا جاتا؛ لیکن اس کے منتخب حصے پڑھنے کا موقع ملا اور اللہ کا شکر ہے کہ ایک عجمی کی اس تحریر کو عرب علماء کے درمیان خاصی پذیرائی حاصل ہوئی، صدر اجلاس نے بھی اپنے صدارتی کلمات میں بلند الفاظ میں اس کا ذکر کیا، ڈاکٹر ترکی اور مختلف علماء نے بھی اسے ایک رہنما تحریر قرار دیا، یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور موضوع کی اہمیت کا نتیجہ ہے۔

'سنٹر فار پیس اینڈ ٹرو میسیج، حیدرآباد' دعوتی مقصد ہی کے تحت قائم ہے، سنٹر کے ذمہ داروں کی خواہش ہوئی کہ اسے کتابی شکل میں طبع کیا جائے؛ چنانچہ اب یہ امانت قارئین کی نذر ہے، اس کا عربی ترجمہ ــــ جو کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا، ــــ بھی المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے شعبۂ دعوت کی جانب سے شائع ہو چکا ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تحریر کو قبول فرمائے اور اسے کچھ مسلمانوں کے سینوں میں آتشِ دعوت سلگانے اور انھیں ان کے فریضۂ منصبی کی طرف متوجہ کرنے کا اپنے فضل وکرم سے ذریعہ بنادے۔

خالد سیف اللہ رحمانی

۱۶؍صفر المظفر ۱۴۳۰ھ
۱۲؍فروری ۲۰۰۹ء

☆ ☆ ☆ ☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلىٰ آله وصحبه اجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين .

دعوت دین کی اہمیت وضرورت اوراس سلسلے میں مسلمانوں کی ذمہ داری دو بنیادی عقیدوں سے متعلق ہے، ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ مکمل ہو چکا ہے، آپ ﷺ کے بعد کسی قسم کی کوئی نبوت باقی نہیں رہی؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ . (۱)

محمد تم میں سے کسی مرد کے والد نہیں ہیں ؛ البتہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے سلسلہ پر مہر لگانے (یعنی ختم کرنے والے) ہیں۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات میں اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا :

انا آخر الانبياء وانتم آخر الامم ومسجدی آخر المساجد . (۲)

---

(۱) الاحزاب:۴۰

(۲) سنن ابن ماجه ، عن ابی امامة الباهلیؓ ، كتاب الفتن ، باب فتنة الدجال وخروج عيسىٰ بن مريم عليه السلام، حدیث نمبر:۴۰۷۷

میں آخری نبی ہوں، تم آخری اُمت ہو اور میری مسجد (کسی نبی سے نسبت رکھنے والی) آخری مسجد ہے۔

اس مضمون کی احادیث اپنے مجموعہ کے اعتبار سے تواتر معنوی کو پہنچتی ہے؛ اسی لئے جو شخص آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے یا کسی مدعی نبوت کی تصدیق کرے، اس کے کفر میں کسی شک کی گنجائش نہیں، — عقیدۂ ختم نبوت کے لوازم میں سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قیامت تک کے لئے ہے اور پوری انسانیت آپ کے نبوت کے سایہ میں ہے، قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے :

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا . (۱)

آج میں نے تم پر تمہارا دین مکمل کر دیا، اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے بہ حیثیت دین اسلام کو پسند کیا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بارے میں ارشاد ہے :

وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ . (۲)

اور ہم نے آپ کو پوری انسانیت کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

غرض کہ آپ ﷺ کی نبوت کے دائرہ میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پوری انسانیت — بلا امتیاز رنگ ونسل وبلا فرق زبان وعلاقہ اور بلا تفریق مکان وزمان — داخل ہے۔

دوسرا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات انسانیت کے لئے رحمٰن ورحیم ہے؛ اس لئے جیسے اس نے انسان کی دوسری ضروریات کا انتظام کیا ہے، ویسے ہی انسان کی ہدایت اور اس کی ابدی نجات کا بھی سروسامان فرمایا ہے؛ چنانچہ اس نے انسانیت کی ہدایت کی غرض سے انبیاء کو بھیجا اور ان کے ذریعہ اپنی کتابیں انسانیت کے لئے نازل فرمائیں،

---

(۱) المائدۃ:۳　　(۲) السباء:۲۸

جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے وقت میں سرچشمۂ ہدایت اور روشنی تھی، چنانچہ تورات کے بارے میں فرمایا گیا :

اِنَّا اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰاةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ ۔ (۱)

بے شک ہم نے تورات اُتاری ہے ، جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔

اور قرآن مجید کے بارے میں ارشاد ہے کہ یہ حق کی تلاش کرنے والوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہے: ''هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ'' ۔(۲)

نیز دنیا میں وسائل ہدایت کا باقی رہنا اللہ تعالیٰ کے رب العالمین ہونے کا لازمی تقاضہ ہے، جب انسانیت کے لئے ہدایت کی ضرورت قیامت تک باقی رہنے والی ہے اور نبوت کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام ہو چکا ہے، تو سوال یہ ہے کہ انسانیت تک خدا کا پیغام ہدایت کیوں کر پہنچے گا ؟ —— قرآن مجید میں اس سوال کا جو جواب ملتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے لئے ایک طرف قرآن مجید قیامت تک محفوظ رہے گا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت خود اپنے ذمہ رکھی ہے، ''اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ'' (۳) دوسری طرف جیسے انبیاء اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوا کرتے تھے، اسی طرح یہ اُمت پوری انسانیت کی طرف مبعوث کی گئی ہے :

كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ ۔ (۴)

تم بہترین اُمت ہو، جو لوگوں کے لئے بھیجے گئے ہو؛ تاکہ بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔

قرآن مجید میں اس بات کو بار بار واضح کیا گیا ہے، گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) المائدۃ:۴۴ (۲) البقرۃ:۲
(۳) الحجر:۹ (۴) آلِ عمران:۱۱۰

جس طرح اس اُمت کی طرف مبعوث فرمائے گئے، اسی طرح یہ اُمت پوری انسانیت کی طرف مبعوث کی گئی ہے :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا . (۱)

اوراسی طرح ہم نے تم کو میانہ رواُمت بنایا ہے؛ تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنواور رسول تم پر گواہ بنے۔

گذشتہ اُمتوں کے مقابلے اس اُمت کا امتیاز یہ ہے کہ پچھلی اُمتوں کی دعوت واصلاح کا کام ان کے انبیاء کی طرح خودان کی قوم تک محدود تھا اور امت محمدیہ کی دعوت کا دائرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عالمگیر نبوی حیثیت کے پس منظر میں پوری انسانیت تک وسیع ہے، جیسے انبیاء کے لئے دعوت ان کا بنیادی اور منصبی فریضہ ہے، اسی طرح اس اُمت کے لئے بھی دعوتِ دین بنیادی فریضہ ہے۔

اگر کوئی مسلمان اسلام کے اقرار کے باوجود دعوتِ دین کی طرف سے بے توجہ ہے، تو گویا وہ ایک طرح کے نفاق میں مبتلا ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ ...... وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ . (۲)

منافق مرد وعورت ایک دوسرے کے دوست ہیں، جو برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے منع کرتے ہیں اور مومن مرد وعورت ایک دوسرے کے دوست ہیں، جو بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں۔

---

(۱) البقرۃ:۱۴۳ (۲) التوبہ:۶۷،۷۱

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ فخر الدین رازی (م:۶۰۴ھ) فرماتے ہیں :

واعلم انه تعالیٰ لما وصف المومنين بكون بعضهم اولياء بعض ذكر بعده ما يجرى مجرى التفسير والشرح له ، فقال تعالیٰ : يامرون بالمعروف وينهون عن المنكر ويقيمون الصلوٰة ويوتون الزكوٰة ويطيعون الله ورسوله ، فذكر هذه الامور الخمسة التى بها يتميز المومن من المنافق . (۱)

جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے جب مومن کے ایک دوسرے کے دوست ہونے کی صفت بیان فرمائی تو اس کے بعد ایسی بات ذکر کی، جو اس کی شرح وتفسیر کے درجہ میں ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے ہیں'' غرض کہ ان پانچ باتوں کا ذکر فرمایا، جن سے مسلمان اور منافق کے درمیان امتیاز قائم ہوتا ہے۔

نیز علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں :

فجعل تعالیٰ الامر بالمعروف والنهى عن المنكر فرقاً بين المومنين والمنافقين فدل على أن اخص اوصاف المومن الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر . (۲)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مسلمانوں اور منافقین کے درمیان وجہِ امتیاز قرار دیا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مومن کا اہم ترین وصف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

---

(۱) مفاتیح الغیب:۹۴/۸ (۲) تفسیر قرطبی:۴۷/۴

دعوت کا نفع جہاں ان لوگوں کو پہنچتا ہے، جن کو دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت سے سرفراز فرماتے ہیں، وہیں اس کا نفع خود دعوت دینے والوں کے لئے بھی ہے؛ یہاں تک کہ مدعو دعوت کو قبول کرے یا نہیں کرے اور وہ قبول و اعتراف کا راستہ اختیار کرے یا جحود وانکار کا، داعی بہر حال فائدہ سے محروم نہیں ہوتا؟ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

سَوَاۤءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ . (۱)

''ان'' کے لئے برابر ہے، آپ انھیں ڈرائیں یا نہیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

یوں نہیں فرمایا :

سَوَاۤءٌ عَلَيۡکَ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ .

''آپ'' کے لئے برابر ہے کہ انھیں ڈرائیں یا نہیں۔

دعوت کے فوائد

داعی کو دعوت سے جو دنیوی اور اخروی فوائد پہنچتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں :

۱- اس کی شرعی ذمہ داری ادا ہوتی ہے اور وہ عند اللہ جواب دہی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

۲- آخرت میں اسے بے حد اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے؛ کیوں کہ جو شخص جس آدمی کی کوشش سے ایمان کے دائرہ میں آئے اور صراط مستقیم کو اختیار کرے، اس کی نیکیوں میں وہ عند اللہ شریک سمجھا جاتا ہے؛ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**الدال علی الخیر کفا علہ**''(۲) اور جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''**من سن سنة حسنة**''۔(۳)

---

(۱) البقرۃ:۶

(۲) سنن ترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء الدال علی الخیر کفاعلہ، حدیث نمبر:۲۶۷۰

(۳) سنن ابن ماجہ، باب من سن سنة حسنة أو سیئة، حدیث نمبر:۲۰۳

جس نے اچھا طریقہ جاری کیا، اس پر عمل کیا جائے تو اس کے
لئے اس کا اجر بھی ہے اور ان لوگوں کا اجر بھی، جو اس پر عمل
کریں، بغیر اس کے کہ خود ان کے اجر میں کوئی کمی ہو، اور جس
نے برا طریقہ جاری کیا، پھر اس پر عمل کیا جائے، تو اس پر خود
اس کے عمل کا گناہ بھی ہوگا اور دوسرے عمل کرنے والوں کا
گناہ بھی، نیز خود اس کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

۳- ترکِ دعوت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا عذاب متوقع ہے اور من جملہ اس کے یہ بھی ہے کہ ایسے شخص یا گروہ کی دُعاء قبول نہیں ہوتی، فریضۂ دعوت ادا کر کے مسلمان اس سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں، چنانچہ حضرت حذیفہ بن یمان سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

والذی نفسی بیده لتامرن بالمعروف ولتنهون عن المنکر اولیوشکن الله ان یبعث علیکم عقابا من عنده ثم لتد عنه فلا یستجیب لکم . (۱)

اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم نیکی کا
حکم دو اور برائی سے روکو، یا قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی
طرف سے عذاب نازل کریں، پھر تم دُعاء کرو اور تمہاری دُعاء
قبول نہ کی جائے۔

۴- جو گروہ دعوت کا کام کرتا ہے، من جانب اللہ دشمنوں سے اس کی حفاظت ہوتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا :

یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ . (۲)

---

(۱) رواه الترمذی، کتاب الفتن، باب الامر بالمعروف والنهی عن المنکر، حدیث نمبر:۲۱۶۹

(۲) المائدة:۶۷

اے رسول! آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب سے
جو دین اُتارا گیا ہے، اسے پہنچا دیجئے، اگر آپ نے ایسا نہیں
کیا تو حق رسالت ادا نہیں کیا اور لوگوں سے تو اللہ آپ کی
حفاظت کریں گے۔

—— یہ آیت واضح کرتی ہے کہ تبلیغ رسالت سے ''**عصمت من الناس** ''(لوگوں سے حفاظت) متعلق ہے ، معلوم ہوا کہ جب اُمت تبلیغ رسالت کے فریضہ سے غافل ہوجائے گی ،تو اللہ کی طرف سے عصمت وحفاظت سے بھی محروم ہوجائے گی ، یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ قرآن مجید میں اکثر مواقع پر ''ناس'' کا لفظ کفار ومشرکین کے لئے بولا گیا ہے، گویا دعوت کفار ومشرکین سے حفاظت کا ایک غیبی نسخہ ہے۔

۵- دعوتِ دین کی خدمت جب بھی انجام دی جائے گی ، دو باتوں میں سے ایک بات ضرور سامنے آئے گی ، یا تو گم گشتہ راہ لوگوں کو ہدایت حاصل ہوگی اور یہی مقصود ہے، یا ان پر حجت تمام ہوجائے گی ، پھر اللہ کی طرف سے مسلمانوں کی مدد ہوگی اور وہ عذاب الٰہی کے مستحق قرار پائیں گے؛ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا کہ فریضۂ دعوت سے گریز کی وجہ سے دُعائیں رد کردی جائیں گی اور لوگ اللہ کی مدد سے محروم کردیئے جائیں گے، چنانچہ حضرت عائشہ سے مروی ہے :

**دخل عليّ النبی صلی اللہ علیه وسلم فعرفت فی وجهه
ان قد حضره شئ فتوضاء وما کلم احداً فلصقت
بالحجرة استمع ما یقول ، فقعد علی المنبر فحمد اللہ
واثنی علیه وقال : یا ایها الناس ! ان اللہ تعالیٰ یقول
لکم : مروا بالمعروف وانهوا عن المنکر قبل ان تدعوا
فلا اجیب لکم وتسألونی فلا اعطیکم وتستنصرونی
فلا انصرکم فما زاد علیهن حتی نزل .** (۱)

(۱) ابن حبان ، کتاب البر والاحسان ، باب الصدق والامر بالمعروف والنهی عن المنکر ، حدیث نمبر:۲۹۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے، میں
نے آپ کے چہرۂ انور پر تفکر محسوس کیا کہ کوئی بات پیش آئی
ہے؛ چنانچہ آپ نے وضوء فرمایا اور کسی سے گفتگو نہیں کی، پھر
حضور ﷺ کی بات سننے کے لئے میں حجرہ سے لگ گئی، آپ
منبر پر بیٹھے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور فرمایا" اے لوگو! اللہ تم
سے فرماتے ہیں: نیکی کا حکم کرتے رہو اور برائی سے روکتے
رہو، اس سے پہلے کہ تم دُعاء کرو اور میں تمہاری دُعاء قبول نہ
کروں اور تم مانگو اور میں عطا نہ فرماؤں اور تم مدد چاہو اور میں
تمہاری مدد نہ کروں" اس سے زیادہ آپ نے کچھ نہیں فرمایا
اور منبر سے اُتر گئے۔

غور کیا جائے تو اس وقت دنیا کے بہت سے علاقوں میں صورت حال یہ ہے کہ اُمت مسلمہ پر ظالم حکومتوں کا تسلط ہے، جس کی سب سے بڑی مثال سرزمین قدس ہے، دنیا کے بہت سے علاقوں میں مسلمان غیر محفوظ ہیں، وہ اپنے مذہب، تمدن، جان و مال اور عزت و آبرو کے سلسلے میں عدم تحفظ سے دوچار ہیں، حرمین شریفین سے لے کر پوری دنیا کی مسجدوں تک ہر جگہ دُعائیں ہوتی ہیں اور خدا سے مدد مانگی جاتی ہے، مگر صورت حال یہ ہے کہ دن بدن مسلمانوں کے حالات بگڑتے ہی جاتے ہیں، جو آیات واحادیث اوپر ذکر کی گئی ہیں، وہ ہمیں بتاتی ہیں کہ اس صورتِ حال کا حقیقی سبب خدا کے غیبی نظام کے تحت یہ ہے کہ ہم نے بہ حیثیت اُمت دعوتِ دین کے کام سے منھ موڑ لیا ہے؛ اسی لئے دعوتِ دین وہ اہم فریضہ ہے، جس کی طرف مسلمانوں کو پوری یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہونا ضروری ہے اور خدا کے غیبی نظام میں یہی ان کے تحفظ کا راستہ ہے۔

دعوتِ دین فرض عین ہے یا فرض کفایہ؟

اسی لئے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ دعوتِ دین محض کوئی مباح یا مستحب عمل نہیں

ہے؛ بلکہ یہ اس اُمت پر فرض ہے، اختلاف اس میں ہے کہ یہ فرض عین ہے یا فرض کفایہ؟ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ دعوت فرض عین ہے، یعنی ہر شخص پر انفرادی حیثیت میں فرض ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے پوری اُمت مسلمہ کو کارِ دعوت کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ امام فخر الدین رازیؒ (م:۶۰۴ھ) ''وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ''(۱) کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> **فی قوله تعالیٰ " منکم " قولان : القول الاول : ان " من " هنا لیست للتبعیض لدلیلین : الاول : ان الله تعالیٰ أوحب الامر بالمعروف والنهی عن المنکر علی کل الامة فی قوله تعالیٰ " کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر (۲) الثانی : هو انه لا مکلف الا ویجب علیه الامر بالمعروف والنهی عن المنکر إما بیده ، أو بلسانه أو بقلبه ، ویجب علی کل أحد دفع الضرر عن النفس ، اذا ثبت هذا فنقول : معنی هذه الآیه : کونوا دعاة الی الخیر آمرین بالمعروف ناهین عن المنکر ، واما کلمة " من " فهی هنا للتبیین لا للتبعیض کقوله تعالی " فاجتنبوا الرجس من الاوثان " (۳) ویقال ایضا : لفلان من اولاده جند وللامیر من غلمانه عسکر ، یرید بذلک جمیع اولاده وغلمانه لا بعضهم ، کذا ههنا . (۴)**

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''منکم'' میں دو قول ہیں: پہلا قول یہ کہ ''من'' یہاں ''بعض'' کے معنی میں نہیں ہے، اور اس کی دو

---

(۱) آلِ عمران:۱۰۴
(۲) آلِ عمران:۱۱۰
(۳) الحج:۳۰
(۴) مفاتیح الغیب:۴/۲۷۶

دلیلیں ہیں اول: یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قول ''کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ الخ'' (آلِ عمران:۱۱۰) میں پوری اُمت پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب قرار دیا ہے، دوسرے یہ کہ ہر مکلّف پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے، چاہے ہاتھ سے کرے، یا زبان سے یا دل سے،...... جب یہ بات ثابت ہوگئی تو ہم کہیں گے کہ اس آیت کے معنی ہیں کہ بھلائی کا حکم دیتے ہوئے اور برائی سے روکتے ہوئے خیر کی طرف داعی بن جاؤ، لہٰذا ''من'' یہاں بیان کے لئے ہے نہ کہ بعض کے معنی میں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد —''فَاجْتَنِبُوْا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ'' بتوں کی نجاست سے بچو(۱) — میں، (یعنی بعض بتوں سے بچنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے؛ بلکہ تمام بتوں سے بچنے کا حکم فرمایا گیا ہے)۔

اس نقطۂ نظر کے مطابق تو ہر مسلمان پر اپنی صلاحیت اور طاقت واستطاعت کے مطابق دعوتِ دین کا کام فرض ہے؛ اسی لئے اہل سنت والجماعت نے داعی کے لئے عادل ہونے کی شرط نہیں لگائی ہے، اگر کوئی مسلمان فاسق ہو، تب بھی اسے دعوت کا کام کرنا چاہئے، چنانچہ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں :

ولیس من شرط الناھی ان یکون عدلاً عند اھل السنة ، خلافاً للمبتدعة ، حیث یقول : لا یغیرہ إلا عدل ، وھذا ساقط ؛ فان العدالة محصورة فی القلیل من الخلق والامر بالمعروف والنھی عن المنکر عام فی جمیع الناس . (۲)

---

(۱) الحج :۳۰ (۲) تفسیر قرطبی:۴/۴۷

اہل سنت والجماعت کے نزدیک برائی سے روکنے والے کے لئے شرط نہیں ہے کہ وہ عادل بھی ہو، بخلاف مبتدعین کے، کہ وہ کہتے ہیں: عادل ہی برائی کو بدل سکتا ہے اور اس قول کا اعتبار نہیں؛ اس لئے کہ عدالت تو کچھ لوگوں میں محدود ہے، جب کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمام لوگوں میں عام ہے۔

یہی بات امام رازیؒ (م:۶۰۴ھ) نے بھی لکھی ہے :

والعلماء قالوا : الفاسق له أن يامر بالمعروف لأنه وجب عليه ترک ذلک المنکر ووجب عليه النهی عن ذلک المنکر . (۱)

علماء نے کہا ہے کہ فاسق نیکی کا حکم دے سکتا ہے، اس لئے کہ اس برائی کو خود ترک کرنا بھی واجب ہے اور اس سے روکنا بھی واجب ہے، یعنی دونوں مستقل دو الگ الگ واجبات ہیں۔

نیز اسی آیت کی توضیح میں علامہ ابن کثیرؒ (م:۷۷۴ھ) فرماتے ہیں :

والمقصود من هذه الآيه أن تكون فرقة من هذه الامة متصدية لهذا الشان وإن كان ذلک واجبا على كل فرد من الأمة بحسبه كما ثبت فی صحيح مسلم عن ابی هريرة قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : من رایٰ منكم منكراً فليغيره بيده ، فان لم يستطع فبلسانه ، فان لم يستطع فبقلبه ، وذلک اضعف الايمان حبة خردل . (۲)

اس آیت کا منشاء یہ ہے کہ اس اُمت کا ایک گروہ اس کام کے لئے مستعد رہے، اگر چہ اُمت کے ہر فرد پر اس کی صلاحیت

---

(۱) مفاتیح الغیب:۳۷۸/۴ (۲) تفسیر ابن کثیر:۳۹۰/۱

کے مطابق دعوت واجب ہے ؛ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
تم میں سے جو کسی برائی کو دیکھے وہ اسے ہاتھ سے روکے، اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اور اس کی بھی نہ ہو تو دل سے، یہ ایمان کا سب سے کم تر درجہ ہے، اس کے بعد رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہیں۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دعوت فرض کفایہ ہے، یعنی اُمت میں ایک گروہ کو بہر حال فریضۂ دعوت کو ادا کرنا چاہئے ؛ لیکن ہر شخص پر انفرادی حیثیت میں دعوت واجب نہیں، امام رازیؒ (م:۶۰۴ھ) اس نقطۂ نظر کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

القول الثانی ان " من " هنا للتبعیض ، والقائلون بهذا القول اختلفوا ایضاً علی قولین : احدهما : ان فائدة کلمة " من " هی أن فی القوم من لا یقدر علی الدعوة ولا علی الامر بالمعروف والنهی عن المنکر مثل النساء ، والمرضٰی والعاجزین : وثانیهما ، ان هذا التکلیف مختص بالعلماء . (۱)

دوسرا قول یہ ہے کہ ''من'' یہاں ''بعض'' کے معنی میں ہے، پھر جو حضرات اس کے قائل ہیں، ان کے بھی دو قول ہیں : ایک یہ کہ ''من'' (بہ معنی بعض) کا فائدہ یہ ہے کہ قوم میں کچھ ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو دعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قادر نہ ہوں، جیسے: ''عورتیں، بیمار، عاجز حضرات'' دوسرا قول یہ ہے کہ ''دعوت کے مکلّف صرف علماء ہیں''۔

---

(۱) مفاتیح الغیب:۳۷۶/۴

ایک قول یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ ''ولتکن منکم امة'' سے مراد صرف صحابہ کی ذات ہے، یہ ضحاک کا قول ہے،(۱) لیکن الفاظ قرآنی میں اس تخصیص پر کوئی دلیل نہیں ہے؛ اسی لئے اہل علم نے اس تیسرے نقطۂ نظر کو قبول نہیں کیا ہے، چنانچہ علامہ ابن کثیر (م:۷۷۴ھ) فرماتے ہیں :

والصحیح ان هذه الآیة عامة فی جمیع الامة کل قرن بحسبه . (۲)

صحیح یہ ہے کہ یہ آیت پوری اُمت کے لئے عام ہے، ہر زمانہ میں اس زمانے کے مطابق۔

فرض کفایہ سے مراد

بہر حال جمہور کے نزدیک دعوت فرض کفایہ ہے، اس سے بعض حضرات کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اگر پوری اُمت میں سو دو سو آدمی بھی دعوت کا کام کرتے ہوں، تو پوری اُمت کی طرف سے فریضۂ دعوت ادا ہو جائے گا؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ غلط فہمی پر مبنی ہے، فرض کفایہ سے مراد یہ ہے کہ اتنے لوگ اس فریضہ کو ادا کرنے والے موجود ہوں، جو اس کی ادائیگی کے لئے کافی ہو جائیں، جیسے میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے اور غسل کے لئے ایک آدمی کافی نہ ہو سکے، دو یا چار آدمی کی ضرورت ہو، تو جب تک اتنے افراد مہیا نہ ہو جائیں، فرض کفایہ ادا نہیں ہوگا، اسی طرح عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہے، ظاہر ہے کہ دو چار آدمی جہاد نہیں کر سکتے، جہاد کے لئے دشمن کی طاقت کے اعتبار سے ایک فوج مطلوب ہے، جب تک اتنے افراد مہیا نہ ہو جائیں، فرض کفایہ باقی رہے گا؛ اسی لئے علامہ علاء الدین حصکفی حنفیؒ (م:۱۰۸۸ھ) نے لکھا ہے کہ اگر مسلمانانِ روم اپنے قریب کے لوگوں سے جہاد کریں، تو اہل ہند سے فریضۂ جہاد ساقط نہیں ہوگا :

---

(۱) مفاتیح الغیب:۳۷۷/۴ (۲) تفسیر ابن کثیر:۳۹۱/۱

وایاک ان تتوهم ان فرضیته تسقط عن اهل الهند بقیام اهل الروم مثلاً . (۱)

تم کو یہ وہم نہ ہو کہ مثلاً اہل روم کے جہاد کرنے سے اہل ہند سے جہاد ساقط ہو جائے گا۔

نیز علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ فرماتے ہیں :

ومعنی الکفایة فی الجهاد ان ینهض للجهاد قوم یکفون فی قتالهم ، إما ان یکونوا جندا لهم دواوین من اجل ذلک ، أو یکونوا قد اعدوا انفسهم له تبرعاً بحیث إذا قصدهم العدو ، حصلت المنعة بهم . (۲)

جہاد کے فرض کفایہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ جہاد کے لئے اتنے لوگ تیار ہوں جو جنگ کی ضرورت پوری کرنے کے لئے کافی ہوں ، یا تو باضابطہ درج رجسٹر (تنخواہ دار) فوجی ہوں، یا تبرعاً انھوں نے اپنے آپ کو جہاد کے لئے تیار رکھا ہو؛ بہر حال وہ اس موقف میں ہوں کہ دشمن حملہ کریں تو یہ دفاع کے لئے کافی ہو جائیں۔

فرض کفایہ کی تعریف میں اس حقیقت کی طرف اشارہ موجود ہے اور بعض اہل علم نے اس کو زیادہ وضاحت وصراحت کے ساتھ بھی لکھا ہے، جیسے موجودہ عہد کے اہل علم میں ڈاکٹر عبدالکریم بن علی ''واجب کفائی'' کا حکم بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

وحکمه أنه إذا قام به من یکفی من المکلفین سقط عن الباقین و إذا لم یؤده احد لحق الإثم جمیع المکلفین . (۳)

---

(۱) الدر المختار مع الرد:۲۰۰/۶-۲۰۱ (۲) المغنی:۸/۱۳

(۳) المهذب فی علم اصول الفقه:۲۱۵/۱

> اس کا حکم یہ ہے کہ جب مکلّف لوگوں میں سے اس ذمہ داری
> کے لئے کفایت کرنے کے بہ قدر لوگ اس کو انجام دیں تو باقی
> لوگوں سے ذمہ داری ساقط ہوجائے گی اور کوئی بھی اس
> ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو سبھوں کو گناہ ہوگا۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ اگر کسی فرض کفایہ کی ادائیگی اس وقت تک نہ ہو پائے، جب تک سارے لوگ اس میں نہ لگ جائیں، تو اس وقت وہ فرض عین کا درجہ حاصل کر لیتا ہے، جیسا کہ جہاد کے سلسلے میں فقہاء کی تصریحات موجود ہیں۔

غرض کہ فرض کفایہ ہونے کا مقصد یہ ہے کہ اس کام میں اتنے لوگ لگ جائیں، جو اس کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے کافی ہوجائیں، اب موجودہ دور میں صورتِ حال یہ ہے کہ پوری دنیا نے ایک گاؤں کی صورت حاصل کر لی ہے، جس میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد بیس فیصد یا اس سے کچھ زیادہ ہے، تقریباً مسلمانوں کی آبادی کا یہی تناسب خود ہمارے ملک ہندوستان میں بھی ہے، ان میں وہ لوگ بھی ہیں، جو پوری طرح صراط مستقیم پر قائم ہیں اور وہ لوگ بھی ہیں، جو فکری و عملی انحراف میں مبتلا ہیں، اب اگر صرف غیر مسلم بھائیوں تک ہی دعوت پہنچانے کی بات ہو تو ان کی تعداد اسی فیصد ہے، گویا ہر مسلمانوں کو کم سے کم چار انسانی بھائیوں تک دعوتِ دین پہنچانی ہے، ظاہر ہے کہ اگر ہزار دو ہزار افراد، مسلمانوں کی کوئی ایک دو تنظیم یا کسی خاص علاقہ کے مسلمان اس کے لئے جدوجہد کریں، تو پوری انسانیت تک اسلام کی دعوت کیوں کر پہنچ سکتی ہے؟ —— لہٰذا صرف فرض کفایہ کے لفظ سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے۔

علاقوں کے اعتبار سے دعوت کی اہمیت

مسلمان دنیا کے جن ملکوں میں آباد ہیں، وہ بنیادی طور پر دو طرح کے ہیں: ایک وہ جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے، دوسرے وہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں یا اکثریت میں

ہونے کے باوجود محکوم ہیں، اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس وقت پچاس فیصد سے زیادہ مسلمان ایسے ملکوں میں ہیں، جہاں اقتدار کی باگ وڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے، چنانچہ انڈونیشیا کے بعد سب سے زیادہ مسلمان ہندوستان میں بستے ہیں، چین اور روس میں مسلمانوں کی آبادی اتنی کثیر ہے کہ ان کی تعداد بیشتر مسلمان ملکوں سے زیادہ ہے، ان حالات میں ہمیں دونوں طرح کے حالات میں زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں کے بارے میں طے کرنا ہوگا کہ دعوتی نقطۂ نظر سے ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

دعوتِ دین اور غیر مسلم ممالک

اس لئے پہلے ہم ان ممالک کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں، جو اقلیت میں ہیں یا محکوم ہیں، —— ایسے مسلمانوں کے لئے بنیادی طور پر تین ہی راستے ہوسکتے ہیں: جہاد، ہجرت، دعوت۔

جہاد اور غیر مسلم ممالک

جہاں تک جہاد کی بات ہے تو یہ ایک قانونی عمل ہے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں فقہاء نے اس کے لئے کچھ شرطیں ذکر کی ہیں، جب تک یہ شرطیں نہیں پائی جائیں، جہاد کرنا درست نہیں، اس سلسلہ میں ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ جہاد ان ہی قوموں سے جائز ہے، جن تک اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہو، یہاں اس سلسلے میں چند روایات کا نقل کرنا مناسب ہوگا :

○ عن ابن عباس قال : ما قاتل رسول الله صلى الله عليه وسلم قوماً حتى دعاهم . (۱)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قوم سے اس وقت تک جہاد نہیں کیا، جب تک کہ ان کو دعوت نہ دیدی۔

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۰۵۳، ۲۱۰۵، سنن دارمی، حدیث نمبر: ۲۴۴۴

○ عن علیؓ : ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالہ : حین بعثہ لا تقاتل قوماً حتی تدعوھم . (۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوج کو بھیجتے ہوئے ہدایت فرماتے تھے، جب تک کسی قوم کو دعوت نہ دیدو، اس وقت تک ان سے جنگ نہ کرو۔

○ عن فروۃ بن مسیک قال : اتیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت : یا رسول اللہ ! اقاتل بمن اقبل من قومی من ادبر منھم ؟ قال : نعم ، فلما ادبر ، دعاہ ، فقال : ادعھم إلی الإسلام ، فان ابوا فقتلھم . (۲)

حضرت فروہ بن مسیک سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا: کیا میں اپنی قوم میں سے دین حق کو قبول کرنے والوں کو لے کر اس سے منھ موڑنے والے سے جہاد کروں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، جب میں مڑا تو آپ نے مجھے بلایا اور فرمایا: جب تک انھیں اسلام کی دعوت نہ دیدو ان سے جنگ نہ کرو۔

اسی لئے محدثین نے اپنی کتاب میں ''**باب الدعوۃ قبل الجھاد**'' کا باب قائم کیا ہے، اسی طرح فقہاء نے جہاد سے پہلے تبلیغ دین کو واجب قرار دیا ہے، چنانچہ فقہاء حنفیہ میں علامہ برہان الدین بخاری (م:۶۶۱ھ) فرماتے ہیں :

یجب ان یعلم بان شرط جواز القتال مع الکفرۃ علی الخصوص أشیاء ثلاثۃ ، أحدھا : امتناعھم عن قبول الاسلام ...... حتی أنہ إذا لم تبلغھم الدعوۃ إلی ذلک لا من حیث الحقیقۃ ولا من حیث الاعتبار ، لایباح

---

(۱) مصنف عبد الرزاق ، کتاب الجھاد ، باب دعاء العدو، حدیث نمبر:۹۴۲۴

(۲) المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر:۸۳۴

قتالهم إلا بعد تقديم الدعوة . (۱)

یہ جاننا ضروری ہے کہ خاص طور پر غیر مسلموں کے ساتھ جنگ کے جائز ہونے کے لئے تین شرطیں ہیں: ان میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کردیں،...... یہاں تک کہ جب تک ان کو اسلام کی دعوت نہ پہنچ جائے، نہ حقیقتاً اور نہ تقدیراً، ان کو دعوت پیش کئے بغیر ان سے جہاد جائز نہیں۔

علامہ علاء الدین کاسانیؒ (م:۵۸۷ھ) کا بیان ہے :

ولا يجوز لهم القتال قبل الدعوة ؛ لان الايمان وإن وجب عليهم قبل بلوغ الدعوة بمجرد العقل ، فاستحقوا القتل بالامتناع ؛ لكن الله تبارك و تعالى حرم قتالهم قبل بعث الرسول عليه الصلاة والسلام وبلوغ الدعوة اياهم فضلا منه ومنة وقطعاً لمعذرتهم بالكلية ...... ولان القتال مافرض لعينه بل للدعوة الى الاسلام ، والدعوة دعوتان : دعوة بالبنان وهى القتال ، ودعوة بالبيان وهو اللسان ، وذلك بالتبليغ ، والثانية اهون من الاولىٰ.(۲)

مسلمانوں کے لئے غیر مسلموں سے دعوتِ دین پیش کرنے سے پہلے جنگ جائز نہیں؛ اس لئے کہ ایمان لانا اگر چہ ان پر دعوت کے پہنچنے سے پہلے بھی محض عقل کی وجہ سے واجب ہے، لہٰذا وہ ایمان نہ لانے کی وجہ سے قتل کئے جانے کے مستحق ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول کے بھیجنے اور دعوت ان تک پہنچنے سے پہلے —— بہ طور فضل واحسان اور پوری طرح اتمام حجت

(۱) المحیط البرہانی:۹۴/۷ (۲) بدائع الصنائع:۶۱/۶

کے لئے —— جنگ کو حرام قرار دیا اور اس لئے بھی کہ جہاد بذات خود فرض نہیں ہے؛ بلکہ اسلام کی طرف دعوت اصل مقصود ہے اور دعوت جنگ کے ذریعہ بھی ہوتی ہے اور بیان یعنی زبان کے ذریعہ بھی، اور زبان سے دعوت کا طریقہ تبلیغ دین ہے اور دعوت کی یہ دوسری صورت پہلی صورت کے مقابلہ آسان ہے۔

نیز علامہ علاء الدین حصکفیؒ (م:۱۰۸۸ھ) فرماتے ہیں :

ولا يحل لنا ان نقاتل من لا تبلغه الدعوة بفتح الدال الى الاسلام وهو وإن اشتهر فى زماننا شرقاً وغرباً ، لكن لا شک أن فى بلاد الله من لا شعور له بذلک . (۱)

جن لوگوں تک دعوتِ اسلام نہ پہنچی ہو، ہمارے لئے ان سے جنگ کرنا جائز نہیں ہے، اگر چہ ہمارے زمانہ میں مشرق سے مغرب تک اسلام کی شہرت ہو چکی ہے؛ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اللہ کی زمین میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں، جنھیں اس بارے میں واقفیت نہیں ہے۔

اور علامہ شامیؒ نے اس کی توضیح کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر دعوت پہنچانے سے پہلے جنگ کی جائے تو یہ باعث گناہ ہے۔

فلو قاتلهم قبل الدعوة أثم للنهى . (۲)

اگر انھیں دعوت دینے سے پہلے ان سے جنگ کرے گا تو ممانعت کی وجہ سے گنہگار ہوگا۔

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ (م:۶۲۰ھ) نے بھی صراحت کی ہے کہ جن لوگوں تک دعوت

---

(۱) الدرالمختار مع الرد:۲۰۸/۶ (۲) رد المحتار على الدر:۲۰۸/۶

اسلام نہیں پہنچی ہو، ان تک دعوت پہنچائے بغیر ان سے جہاد کرنا جائز نہیں :

فـان مـن بـلـغته الدعوه منهم لا يدعون ، وان وجد منهم من لم تبلغه الدعوة دعى قبل القتال ، وكذلک إن وجد مـن اهـل الكتاب من لم تبلغ الدعوه ، دعوا قبل القتال ، قـال احـمـد : ان الدعوة قد بلغت وانتشرت ، ولكن إن اجـاز ان يـكـون قـدم خـلف الروم وخلف الترک على هذه الصفه لم يجز قتالهم قبل الدعوة . (۱)

غیر مسلموں میں سے جن کو دعوت پہنچ چکی ہو، ان کو دعوت نہیں دی جائے گی اور اگر ان میں بعض لوگ ایسے ہوں ، جن کو دعوت نہیں پہنچی ہوتو جنگ سے پہلے ان کو دعوت دی جائے گی ، اسی طرح اگر اہل کتاب میں سے کچھ ایسے لوگ ہوں ، جن تک اسلام کی دعوت نہیں پہنچی ہوتو انھیں بھی دعوت پیش کی جائے گی ، امام احمد نے فرمایا: اگر چہ دعوت اسلام پہنچ چکی ہے اور عمومی طور پر پھیل چکی ہے ؛ لیکن ہوسکتا ہے کہ رومیوں اور ترکوں کے پیچھے اسلام سے ناواقف قومیں موجود ہوں ؛ اس لئے دعوت دینے سے پہلے ان سے جنگ کرنا جائز نہیں۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے اس سلسلہ میں فقہاء کے مختلف نقاط نظر کو ان الفاظ میں ذکر کیا ہے :

وقد اختلف الفقهاء فى حكم ابلاغ الدعوة على ثلاثة آراء : الاول : يـجـب قبـل الـقتـال تـقـديـم الدعوة الاسلامية مطلقاً ، اى سواء بلغت الدعوة العدو أم لا ، وبـه قـال مـالک والهـا دويـه والـزيـديـه لقوله تعالیٰ

---

(۱) المغنی:۲۹/۱۳

''ستدعون الی قوم أولی باس شدید تقاتلونهم أو یسلمون ـــ الثانی : لا یجب ذلک مطلقاً ، وهو رى قوم کالحنابلة ـــ الثالث : لتجب الدعوة لمن لم یبلغهم الاسلام ، فان انتشر الاسلام وظهر کل الظهور ، وعرف الناس لماذا یدعون ، وعلی ماذا یقاتلون ، فالدعوة مستجبة تاکیداً لاعلام والانذار ولیست بوجبه ، وهذا رای جمهور الفقهاء والشیعه الامامیه والاباضیه ، قال ابن المنذر ، هو قول جمهور اهل العلم ، وقد تظاهرت الاحادیث الصحیحة علی معناه ، وبه یجمع بین ماظاهر الاختلاف من الاحادیث . (۱)

دعوتِ اسلام پہنچانے کا کیا حکم ہے؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے تین اقوال ہیں: اول یہ کہ جنگ سے پہلے دعوتِ اسلام پہنچانا واجب ہے، چاہے دشمن کو دعوت اسلام پہنچ ہو یا نہ پہنچی ہو، امام مالک، ہادر یہ اور زیدیہ اسی کے لئے قائل ہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''عنقریب تمہیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لئے بلایا جائے گا، جو بڑے زور آور ہیں، تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ مطیع ہوجائیں گے'' دوسرا قول یہ ہے کہ پہلے دعوت دینا مطلقاً واجب نہیں، یہ حنابلہ کا قول ہے، تیسرے: جن تک اسلام نہیں پہنچا ہو، ان کو دعوت دینا واجب ہے؛ لہٰذا جب اسلام پھیل جائے، پوری طرح لوگوں پر ظاہر ہوجائے اور لوگ جان لیں کہ انھیں کن باتوں کی دعوت دی جارہی ہے؟ تو اس اطلاع وتنبیہ کو مؤکد کرنے کے لئے دعوت دینا مستحب

(۱) الفقه الاسلامی وأدلته:۶/۴۱۹-۲۰

ہے، واجب نہیں ہے، یہ زیادہ تر فقہاء، شیعہ امامیہ اور اباضیہ کی رائے ہے، ابن منذر کا بیان ہے کہ جمہور اہل علم کا قول یہی ہے، اس بات پر صحیح احادیث شاہد ہیں اور اس طرح احادیث کے ظاہری اختلاف میں تطبیق پیدا کی جاسکتی ہے۔

غرض کہ جس گروہ سے جہاد کیا جائے، ضروری ہے کہ پہلے اسے اسلام کی دعوت پہنچائی جائے، خواہ پہلے سے دعوت پہنچائی گئی ہو یا عین میدانِ جنگ میں ان کو دعوت پیش کی جائے؛ بلکہ جن لوگوں پر پہلے دعوت پیش کی جاچکی ہو، ان پر بھی اس وقت دوبارہ دعوت اسلام پیش کرنا مستحب ہے، جس وقت فوجوں کا سامنا ہو؛ تاکہ پوری طرح حجت تمام ہو جائے، چنانچہ علامہ برہان الدین بخاری (م:۶۱۶ھ) کا بیان ہے :

ثم انما تستحب الدعوة مرة أخرى للتاكيد بشرطين : أحدهما : أن لا يكون في تقديم الدعوة ضرر على المسلمين ...... الشرط الثاني : أن يطمع فيهم ما يدعون اليه . (۱)

پھر بہ طور تاکید دوسری مرتبہ دعوت دینا دو شرطوں کے ساتھ مستحب ہے، ایک یہ کہ دعوت کے پیش کرنے میں مسلمانوں کے لئے نقصان نہ ہو، دوسری یہ ہے کہ جس چیز کی ان کو دعوت دی جارہی ہے، اس کے ثمر آور ہونے کی اُمید ہو۔

جہاد کی شرطوں میں سے دوسری ضروری شرط امیر کا ہونا ہے؛ کیوں کہ جہاد ایک اجتماعی عمل ہے نہ کہ انفرادی، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے :

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : الجهاد واجب عليكم مع كل أمير برا كان أو فاجرا ، والصلاة واجبة

(۱) المحيط البرهاني:۷/۹۵

علیکم خلف کل مسلم برا کان أو فاجرا وإن عمل الکبائر . (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم پر امیر کی اطاعت واجب ہے، چاہے وہ نیکوکار ہو یا بدکار اور ہر مسلمان کے پیچھے نماز واجب ہے، چاہے نیک ہو یا برا، اگرچہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب کیوں نہ ہو؟

اس سلسلے میں علامہ ابن قدامہ مقدسی فرماتے ہیں :

وامر الجهاد موکول إلی الامام واجتهاده ، ویلزم الرعیة طاعته فیما یراه من ذلک . (۲)

جہاد کا معاملہ امام اور اس کی رائے پر موقوف ہے اور وہ جو مناسب سمجھے رعایا کے لئے اس کی اطاعت لازم ہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

وفی الحدیث دلالة علی اشتراط الامیر للجهاد وأنه لا یصح بدونه لقوله صلی الله علیه وسلم : " الجهاد واجب علیکم مع کل امیر الخ " فاذا لم یکن للمسلمین امام فلا جهاد ، نعم ، یجب علی المسلمین أن یلتمسوا لهم امیرا ، ویدل علی أن الجهاد لا یصح إلا بامیر . (۳)

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد کے لئے امیر کا ہونا شرط ہے اور بغیر امیر کے جہاد درست نہیں ؛ اس لئے کہ رسول اللہ

---

(۱) ابوداؤد ، کتاب الجهاد ، باب فی الغزو مع ائمة الجور، حدیث نمبر:۲۵۳۳

(۲) المغنی:۱۶/۱۳   (۳) اعلاء السنن:۴/۱۲

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''الجهاد واجب الخ ...... ''
لہٰذا جب مسلمانوں کا امام موجود نہ ہو تو لوگوں کے لئے جہاد
نہیں ہے، ہاں مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے لئے امیر تلاش
کریں اور یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ بغیر امام کے جہاد
درست نہیں۔

مولانا عثمانیؒ نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ امیر سے کس صلاحیت اور قوت کی شخصیت مراد ہے؟ یعنی یہ کافی نہیں ہے کہ چند افراد اپنے طور پر کسی کو امیر مقرر کرلیں؛ بلکہ باضابطہ ایسا امیر مراد ہے، جو احکام کی تنفیذ ،مظلوم کی انصاف رسانی اور لشکر کی تیاری وغیرہ پر قادر ہو اور اسے ولایت عامہ مطلقہ حاصل ہو، چنانچہ لکھتے ہیں :

ولا يخفى أن الأمير الذى يجب الجهاد معه كما صرح به حديث مكحول ، إنما هو من كان مسلماً ثبتت له الإمارة بالتقليد إما باستخلاف الخليفة إياه كما نقل ابوبكرؓ واما ببيعة من العلماء او جماعة من اهل الرائ والتدبير ، بشرط ان يكون من اهل الولاية المطلقة الكاملة أى مسلما حرا ذكرا عاقلاً بالغاً سائسا اى مالكا للتصرف فى امور المسلمين بقوة رايه ورويته ومعونة باسه وشوكته قادراً بعلمه وعدله وكفايته وشجاعته على تنفيذ الاحكام وحفظ حدود دارا لإسلام وانصاف المظلوم من الظالم اذا الاخلال بهذه الأمور مخل بالغرض من نصب الإمام كذا فى ''شرح العقائد :١٨٠ '' وفى الدر : فى باب الإمامة : هى صغرى وكبرىٰ ، فالكبرى استحقاق تصرف عام على الانام ونصبه من اهم الوجبات ، ويشترط كونه

مسلماً حرا ذكرا عاقلاً بالغاً قادراً قرشيا ، لا هاشميا علويا معصوما وتصح سلطنة متغلب للضرورة ، وقال ابن عابدين : قوله " قادراً " اى على تنفيذ الأحكام وانصاف المظلوم من الظالم وسد الثغور وحماية البيضة وحفظ حدود الاسلام وجر العساكر . (١)

یہ بات مخفی نہ رہے کہ جس امیر کے ساتھ جہاد واجب ہے، وہ مکحول والی حدیث کی صراحت کے مطابق ایسا امیر ہے جو مسلمان ہو، جس کو امارت تفویض کی گئی ہو، یا تو اس طرح کہ خلیفہ نے اس کو نامزد کیا ہو، جیسا کہ حضرت ابوبکر نے کیا، یا علماء اور اصحاب تدبیر کی ایک جماعت نے اس سے بیعت کی ہو؛ بہ شرطیکہ وہ ولایت کاملہ مطلقہ کا اہل بھی ہو، یعنی مسلمان ہو، آزاد ہو، عاقل و بالغ ہو، صاحب سیاست ہو یعنی مسلمانوں کے معاملات میں اپنی خوش تدبیری ، بصیرت ، طاقت اور شرکت کی بنا پر تصرف کر سکتا ہو ، نیز اپنے علم ، عدل وانصاف اور کفایت وشجاعت کی وجہ سے احکام کے نافذ کرنے ، دارالاسلام کی حدود کی حفاظت کرنے اور ظالم سے مظلوم کو انصاف دلانے پر قادر ہو؛ اس لئے کہ ان اُمور میں خلل پیدا ہو جانا امام کے تقرر کے مقصد میں خلل کا باعث ہے، شرح عقائد میں ایسا ہی ہے، (ص: ١٨٠) اور درمختار میں امامت کے باب میں ہے کہ امامت دو طرح کی ہے: صغریٰ (کم درجہ کی) اور کبریٰ (اعلیٰ درجہ کی)، تو امامت کبریٰ مخلوق پر عمومی

(١) اعلاء السنن: ٥/١٢

تصرف کے مستحق ہونے سے عبارت ہے اور اس کا قائم کرنا اہم واجبات میں سے ہے اور اس کے لئے امام کا مسلمان، آزاد، مرد، عاقل، بالغ ہونا، قادر ہونا اور قریشی ہونا ضروری ہے، ہاشمی، علوی اور معصوم ہونا ضروری نہیں، نیز زبردستی غلبہ حاصل لینے والے کی حکومت بھی ضرورۃً درست ہو جائے گی، علامہ شامی کا بیان ہے کہ قادر ہونے سے مراد یہ ہے کہ احکام کی تنفیذ، مظلوم کی انصاف رسانی، سرحدوں کی حفاظت، عام مسلمانوں کے تحفظ، اسلامی حدود کی نگہداشت اور فوجوں کے مہیا کرنے پر قادر ہو۔

جہاد کے لئے امیر کے ضروری ہونے پر بعض اور روایتوں سے بھی استدلال کیا گیا ہے، یہ بات ظاہر ہے کہ ایک امیر کی موجودگی میں دوسرا امیر مقرر نہیں کیا جاسکتا؛ اس لئے خاص کر کسی مسلمان ملک میں اگر چند لوگ مل کر کسی کو اپنا امیر بنالیں اور اس کے تحت جہاد کا فیصلہ کرنے لگیں تو یہ جہاد نہیں ہوگا؛ بلکہ فساد ہوگا، اسی طرح جہاد کفار سے ہے نہ کہ مسلمانوں سے، اگر کچھ لوگ مسلمان حکومت کے خلاف یا مسلمانوں کے کسی گروہ کے خلاف قتل وقتال شروع کردیں تو یہ بھی شرعاً جہاد نہیں کہلائے گا؛ بلکہ فساد فی الارض کا مصداق ہوگا، اگر مسلمان حکمراں ظالم ہوں تو ان سے جہاد باللسان ہونا چاہئے؛ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

أفضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر . (۱)

بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ عدل کہنا ہے۔

جہاد بالسیف کی شرطوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اسباب و وسائل کے اعتبار سے بہ ظاہر مسلمانوں کا کامیاب ہونا متوقع ہو؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) سنن ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب الامر والنهی، حدیث نمبر:۴۳۴۴

اور صحابہ کو مکی زندگی میں جہاد کی اجازت نہیں دی گئی ؛ بلکہ ہجرت سے پہلے بیعت عقبہ میں شریک صحابہ نے جہاد کرنا چاہا، تب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں جہاد کی اجازت نہیں دی، چنانچہ علامہ ابن کثیرؒ (م:۷۷۴ھ) اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں :

وإنما شرع تعالىٰ الجهاد في الوقت الأ ليق به ؛ لأنهم لما كانوا بمكة كان المشركون اكثر عدداً فلو امر المسلمون وهم اقل من العشر بقتال الباقين لشق عليهم ، ولهذا لما بايع أهل يثرب ليلة العقبة رسول الله صلى الله عليه وسلم وكانوا نيفا وثمانين ، وقالوا : يارسول الله ! ألانميل على اهل الوادى يعنون اهل منى ليالى منى فنقتلهم ؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم " إني لم او مر بهذا " فلما بغى المشركون واخرجوا النبى صلى الله عليه وسلم من بين اظهرهم وهموا بقتله وشردوا اصحابه وشذر مذر ، فذهب منهم طائفه الى الحبشة وآخرون الى المدينة ، فلما استقروا بالمدينة ووا فاهم رسول الله صلى الله عليه وسلم واجتمعوا عليه وقاموا بنصره وصارت لهم دار اسلام و معقلاً يلجئون اليه شرع الله جهاد الاعداء . (۱)

اللہ تعالیٰ نے جہاد کو اس کے نہایت مناسب وقت میں مشروع فرمایا؛ اس لئے کہ جب مکہ میں مشرکین تعداد کے اعتبار سے بہت بڑھ کر تھے، اس وقت مسلمانوں کو —— جو دس فیصد سے بھی کم تھے —— بقیہ مشرکین سے جہاد کا حکم دیا جاتا تو ان کے

---

(۱) تفسیر ابن کثیر:۳/۲۲۵

لئے مشقت کا باعث ہوتا ؛ اسی لئے جب اہل مدینہ نے بیعت عقبہ کی شب جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اور اس وقت ان کی تعداد اسی سے زیادہ تھی، تو لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم وادی والوں پر ہلہ نہ بول دیں، یعنی منی میں مقیم لوگوں کو منیٰ کی راتوں میں حملہ کر کے قتل نہ کر دیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھے اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے پھر جب مشرکین نے سرکشی کی اور رسول اللہ صلی اللہ کو مکہ سے نکال دیا، نیز آپ ﷺ کے قتل کے درپے ہو گئے اور آپ ﷺ کے رفقاء کو بھی منتشر ہونے پر مجبور کر دیا، چنانچہ ایک گروہ حبشہ چلا گیا اور دوسرے مدینہ چلے گئے، پھر جب یہ حضرات مدینہ میں مقیم ہو گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آئے، مسلمان آپ ﷺ کے پاس اکٹھا ہو گئے، آپ کی مدد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور مدینہ ان کے لئے دارالاسلام اور محفوظ قلعہ بن گیا، جس کی مسلمان پناہ لے سکیں، تب اللہ تعالیٰ نے دشمنوں سے جہاد مشروع فرمایا۔

اسی لئے فقہاء نے جہاد کے واجب ہونے کے لئے قدرت واستطاعت کی بھی شرط لگائی ہے، علامہ علاء الدین کاسانی (م:۵۸۷) فرماتے ہیں :

لا يفترض إلا على القادر عليه ، فمن لا قدرة له لا جهاد عليه ، لأن الجهاد بذل الجهد وهو الوسع والطاقة بالقتال أو المبالغة فى عمل القتال ، ومن لا وسع له كيف يبذل الوسع والعمل ؟ فلا يفرض على الاعمى والاعرج والزمن والمقعد والشيخ الهرم

والمريض والضعيف والذى لا يجد ما ينفق . (۱)

جوشخص جہاد کرنے پر قادر ہو،اسی پر جہاد فرض ہے،جس کو جہاد کی قدرت نہ ہو، اس پر جہاد فرض نہیں ؛ اس لئے کہ جہاد جہد (کوشش) صرف کرنے کا نام ہے اور جہد سے مراد جہاد کی طاقت اوراس عمل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی صلاحیت ہے اور جس کواس کی طاقت ہی نہ ہووہ کیسے محنت وعمل کرسکتا ہے؟ لہٰذا نابینا ،لنگڑا ، اپاہج ، معذور ، بہت بوڑھا ، بیمار ، کمزور اوراخراجاتِ جہاد کی گنجائش نہ رکھنے والے پر جہاد فرض نہیں ہے۔

وہ اسی مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے آگے لکھتے ہیں :

وعلى هذا الغزاة إذا جاء هم جمع من المشركين مالا طاقة لهم به وخافوهم أن يقتلوهم فلا باس لهم أن ينحازوا إلى بعض امصار المسلمين أو إلى بعض جيوشهم ، والحكم فى هذا الباب لغالب الراى واكبر الظن دون العدد ، فان غلب على ظن الغزاة أنهم يقاومونهم يلزمهم الثبات وإن كانوا اقل عدداً منهم وإن كان غالب ظنهم انهم يغلبون فلا باس ان ينحازوا الى المسلمين يستعينوا بهم ، وان كانوا اكثر عدداً من الكفرة وكذا الواحد من الغزاة ليس معه سلاح مع اثنين منهم معهما سلاح ، أو مع واحد منهم من الكفرة ومعه سلاح فلا باس ان يولى دبره متحيزاً إلى فئة . (۲)

اوراسی بنیاد پر اگر اسلامی فوج کا سامنا مشرکین کی ایسی جماعت سے ہوجائے جن سے مقابلہ کی طاقت نہ ہواور اندیشہ ہو کہ وہ

---

(۱) بدائع الصنائع:۵۸/۶ (۲) بدائع الصنائع:۵۸/۶-۵۹

ان کو قتل کر ڈالیں گے ، تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ مسلمانوں کے کسی شہر یا کسی فوج کی طرف سمٹ آئیں اور اس مسئلہ میں غالب رائے اور گمان کا اعتبار ہے نہ کہ تعداد کا، اگر ان فوجوں کو غالب گمان ہو کہ وہ ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں، تب ثابت قدمی اختیار کرنا ان پر لازم ہے، اگر تعداد میں ان سے کم ہوں اور غالب گمان ہو کہ وہ مغلوب ہو جائیں گے تو مسلمانوں کی طرف کھسک کر آ جانے میں کوئی حرج نہیں ؛ تا کہ ان کی مدد حاصل ہو سکے؛ اگر چہ ان کی تعداد کافروں سے زیادہ ہو، یہی حکم اس وقت ہے جب ایک نہتا مسلمان فوجی دو مسلح یا ایک مسلح کافر کے مقابلہ میں ہو، تو پیچھے ہٹ جانے میں —تا کہ اپنی فوج سے جا ملے،— کوئی حرج نہیں۔

جیسا کہ علامہ کاسانیؒ کی عبارت سے واضح ہوتا ہے: جہاد کی استطاعت میں ہتھیار بھی شامل ہے، علامہ حصکفیؒ (م:۱۰۸۸ھ) اس کو مزید واضح فرماتے ہیں :

وفي السراج : وشرط لوجوبه : القدرة على السلاح . (۱)

سراج نامی کتاب میں ہے: جہاد کے واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ ہتھیار پر قدرت ہو۔

ہتھیار پر قدرت میں ہتھیار کا حاصل ہونا بھی شامل ہے اور ہتھیار چلانے کی تکنیک بھی شامل ہے اور یہ بات بھی شامل ہے کہ اس کے ہتھیار دشمنوں کے ہتھیار کے مقابلہ کے ہوں، مطلق ہتھیار مراد نہیں، توپ اور ٹینک کے مقابلہ میں اگر محض تلوار اور لاٹھی لے کر کوئی شخص چلا جائے تو یقیناً اس کا شمار ہتھیار پر قادر ہونے میں نہیں ہوگا ؛ اسی طرح فقہاء نے

(۱) الدر المختار مع الرد:۲۰۵/۶

جہاد پر قدرت واستطاعت کی تشریح میں انفرادی قدرت کا ذکر کیا ہے، جیسے صحت مند ہونا، معذور نہ ہونا وغیرہ؛ لیکن موجودہ دور میں جنگ ٹکنالوجی کا مقابلہ بن گئی ہے، کوئی شخص کتنا بھی صحت مند ہو؛ لیکن وہ آتشیں ہتھیار کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا؛ اس لئے موجودہ دور میں قدرت و استطاعت میں جنگ کی ٹکنالوجی کے اعتبار سے دشمن کے مقابلہ کی صلاحیت کا حامل ہونا بھی داخل ہے، جس میں ہتھیار، دشمن کے وسائل وامداف سے واقف ہونے کی صلاحیت، جاسوسی کا نظام وغیرہ سب شامل ہیں؛ کیوں کہ موجودہ دور کی جنگ محض انفرادی قوت اور چست طاقتور فوجیوں کے ذریعہ جیتی نہیں جاسکتی۔

فقہاء نے اس جنگ میں شرکت کو واجب قرار نہیں دیا ہے، جس میں ہزیمت کا غالب گمان ہو، چنانچہ علامہ ابن قدامہ (م:۶۲۰ھ) فرماتے ہیں :

> **قال احمد : لا يعجبني أن يخرج مع الامام أو القائد إذ عرف بالهزيمة وتضييع المسلمين وإنما يغزو مع من له شفقة وحيطة على المسلمين .** (۱)
>
> امام احمد نے کہا: مجھے امام یا سپہ سالار کے ساتھ نکلنا پسند نہیں ہے، جب کہ شکست کھانا اور مسلمانوں کا ضائع ہونا معلوم ہو، جہاد اس شخص کے ساتھ کرے، جس میں مسلمانوں کے ساتھ شفقت اور احتیاط ہو۔

حاصل یہ ہے کہ جہاد کے واجب؛ بلکہ جائز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ :

(الف) جس قوم سے جہاد کیا جائے ، اس پر اسلام کی دعوت پہنچائی اور دین کی حجت تمام کی جائے۔

(ب) جہاد ایک قانونی اور اجتماعی عمل ہے، جو ضروری ہے کہ امیر المسلمین کے تحت ہو، اپنے طور پر لوگ کسی گروہ پر حملہ بول دیں، یہ جہاد نہیں۔

---

(۱) المغنی:۱۴/۱۳

(ج) جہاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وسائل جہاد مہیا ہوں اور اس میں کامیابی حاصل ہونے کا غالب گمان ہو۔

(د) جہاد کافروں کے خلاف ہو نہ کہ مسلمانوں کے خلاف یا مسلمان حکومتوں کے خلاف۔

غور کیا جائے تو غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کے حق میں پہلی تینوں شرطیں نہیں پائی جاتیں اور مسلمان ملکوں میں جہاں حکومتوں کے خلاف شورشیں ہوتی ہیں اور ان کو جہاد کا نام دیا جاتا ہے، وہاں بھی اکثر چوتھی شرط نہیں پائی جاتی اور جہاد کے نام پر برادر کشی کا ارتکاب ہوتا ہے۔

دفاع

البتہ یہ احکام اقدامی طور پر جہاد کے لئے ہیں، اگر کسی مسلمان کی جان و مال یا عزت وآبرو پر حملہ ہو یا کسی آبادی میں مسلمان حکومت یا عوام کی اجازت کے بغیر زبردستی دشمن کی فوج داخل ہو جائے، تو پھر دفاع ہر مسلمان کا فریضہ ہے؛ کیوں کہ اسے جنگ پر مجبور کر دیا گیا ہے، ایسی صورتِ حال میں امام کی اجازت یا وسائل جنگ کی فراہمی پر جہاد موقوف نہیں ہوگا؛ جو کچھ طاقت میسر ہو، اس سے مقابلہ کرنے اور دشمن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی؛ کیوں کہ انھیں اس پر مجبور کر دیا گیا ہے، اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من قتل دون ماله فهو شهيد ومن قتل دون دينه ، فهو شهيد ، ومن قتل دون دمه ، فهو شهيد ، ومن قتل دون اهله ، فهو شهيد . (۱)

جو شخص اپنا مال بچانے میں مارا جائے، وہ شہید ہے، جو شخص اپنے دین کی حفاظت کی خاطر مارا جائے، وہ شہید ہے، جو اپنی

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدیات، باب فیمن قتل دون ماله ، فهو شهيد، حدیث نمبر:۱۴۲۱

جان بچانے میں مارا جائے، وہ شہید ہے، جو اپنے اہل وعیال
کی حفاظت کی خاطر مارا جائے، وہ شہید ہے۔

اسی لئے فقہاء نے دفاعی جہاد کے لئے کوئی شرط نہیں رکھی ہے :

...... وواجب على الناس إذا جاء العدو ان ينفروا المقل منهم والمكثر ، ولا يخرجوا الى العدو إلا باذن الامير إلا أن يفجأهم عدو غالب يخافون غلبه ، فلا يمكنهم أن يستاذنوه . (١)

لوگوں پر واجب ہے کہ جب دشمن آجائے تو کم وبیش جو بھی تعداد ہو، نکل جائے، امیر کی اجازت کے بغیر دشمن کے مقابلہ میں نہ جائے، سوائے اس کے کہ زورآور دشمن اچانک آجائے، جس کے غالب ہونے کا اندیشہ ہو اور امیر سے اجازت حاصل کرنے کا موقع نہ ہو۔

یہی نقطۂ نظر جمہور فقہاء کا ہے، چنانچہ الموسوعۃ الفقہیہ میں جمہور کا موقف پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے :

اذا هجم العدو على قوم بغتة فيتعين عليهم الدفع ولو كان إمراة أو صبيا أو هجم على من بقربهم وليس لهم قدرة على دفعه ، فيتعين على من كان بمكان مقارب لهم أن يقاتلوا معهم إن عجز من فجاهم العدو عن الدفع عن انفسهم . (٢)

دشمن کسی گروہ پر اچانک حملہ آور ہوجائے تو ان پر دفاع کا واجب ہونا متعین ہے، چاہے عورت یا بچہ ہی کیوں نہ ہو، اسی

---

(١) المغني:۱۳/۳۳ (٢) الموسوعة الفقهية:۱۶/۱۳۱

طرح قریب کی کسی مسلمان آبادی پر حملہ ہو اور ان میں مدافعت کی طاقت نہ ہوتو متعین ہے کہ اچانک حملہ آور ہونے والے دشمن کے مقابلہ سے یہ عاجز ہوں، تو وہاں سے قریب جو مسلمان ہوں، وہ ان کی طرف سے مدافعت کریں۔

غیر مسلم ممالک اور ہجرت

غیر مسلم حکومت کے زیر اقتدار مسلمانوں کے لئے دوسرا امکانی راستہ 'ہجرت' کا ہوسکتا ہے، ہجرت بنیادی طور پر اپنے دین کو بچانے کے لئے ترکِ وطن کرنے کا نام ہے، اسی صورتِ حال کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے درمیان مسلمانوں کے قیام کو ناپسند فرمایا ہے؛ چنانچہ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

من جامع المشرک وسکن معه ، فانه مثله . (۱)

جو مشرک کے ساتھ رہن سہن رکھے، تو وہ اسی کے مثل ہے۔

اسی طرح حضرت جریر بن عبداللہ سے روایت ہے :

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث سرية الى خثعم ، فاعتصم ناس بالسجود ، فاسرع فيهم القتل ، فبلغ ذلک النبی صلى الله عليه وسلم ، فامر لهم بنصف العقل وقال : أنا برئ من كل مسلم يقيم بين اظهر المشركين ، قالوا : يا رسول الله ! ولم ؟ قال : لا تترائ ناراها . (۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوخثعم کی طرف فوج بھیجی تو

---

(۱) ابوداؤد وسکت علیه،کتاب الجهاد ، باب فی الإقامة بارض الشرک حدیث نمبر:۲۷۸۷

(۲) ترمذی ، کتاب السیر ، باب کراهیة المقام بین اظهر المشرکین، حدیث نمبر:۱۶۰۴

لوگوں نے سجدہ کر کے بچاؤ کرنا چاہا؛ مگر فوجی دستہ نے ان کو بھی قتل کرنے میں جلد بازی سے کام لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع پہنچی تو آپ نے ان کے لئے آدھی دیت کا فیصلہ فرمایا اور کہا: میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو کافروں کے درمیاں مقیم ہو، لوگوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ایسا کیوں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ان دونوں کی آگ ایک دوسرے کو نظر نہ آنی چاہئے۔

خود قرآن مجید میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے، جو فتح مکہ سے پہلے ہجرت پر قادر تھے؛ لیکن انھوں نے ہجرت نہیں کی، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِيْ اَنْفُسِهِمْ ، قَالُوْا : فِيْمَ كُنْتُمْ ؟ قَالُوْا : كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ، قَالُوْا : أَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؟ فَأُوْلٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيْراً ، إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلاَ يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلاً ، فَأُوْلٰئِكَ عَسَى اللهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ، وَكَانَ اللهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا . (۱)

جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے، ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں، تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انھوں نے جواب دیا: ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے، فرشتوں نے کہا: کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ یہ وہ لوگ ہیں، جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ

(۱) النساء:۹۷-۹۹

بڑا ہی برا ٹھکانہ ہے، ہاں! جو مرد عورتیں اور بچے واقعی بے بس
ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے، بعید نہیں کہ اللہ
انھیں معاف کردے، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگذر کر
نے والا ہے۔

اس آیت اور مذکورہ احادیث کی روشنی میں فقہاء نے ہجرت سے متعلق تین ضروری نکات اخذ کئے ہیں :

اول: یہ کہ اگر کسی علاقہ میں مسلمانوں کے لئے احکام دین پر عمل کرنا ممکن نہیں رہے، تو اب بھی ان کے لئے وہاں سے کسی مسلمان ملک کو ہجرت کر جانا واجب ہے، چنانچہ علامہ بدرالدین عینیؒ فرماتے ہیں :

واما الهجرة عن المواضع التى لا يتاتى فيها امر الدين فهى واجبة اتفاقاً . (١)

جہاں احکام دین پر عمل نہیں کرسکتے ، وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے۔

دوسرے: ہجرت ان لوگوں پر واجب ہے، جو اپنے وطن میں اپنے دین کے بارے میں خود کو مامون نہیں پاتے ہوں، چنانچہ حافظ ابن حجر (م:۸۵۲ھ) کا بیان ہے :

وهذا محمول على من لم يامن على دينه . (٢)

یہ اس شخص سے متعلق ہے، جو اپنے دین کے بارے میں مطمئن نہ ہو۔

ابن حجرؒ نے ایک اور موقعہ پر اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ماوردی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اگر غیر مسلم ملک میں اپنے دین پر عمل کرنا ممکن ہو تو وہاں اپنے قیام کو باقی رکھنا زیادہ بہتر ہے؛ تاکہ وہ وہاں داعیانہ کردار ادا کرسکے، ممکن ہے کہ اس کے ذریعہ دوسروں کو

---

(١) عمدة القارى:١٠/٧٨ (٢) فتح البارى:٦/٣٦، كتاب الجهاد والسير

ہدایت حاصل ہو :

والحکم یدور مع علته ، فمقتضاه أن من قدر علی عبادة الله فی أیّ موضع اتفق لم تجب علیه الهجرة منه وإلا وجبت ، ومن ثم قال الماوردی : اذا قدر علی اظهار الدین فی بلد من بلاد الکفر ، فقد صارت البلد به دار اسلام ، فالاقامة فیها افضل من الرحلة لما یترجی من دخول غیره فی الاسلام . (۱)

حکم اپنی علت سے مربوط ہوتا ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ جو کسی بھی جگہ اللہ کی عبادت کرنے پر قادر ہو اس پر وہاں سے ہجرت کرنا واجب نہ ہو، ورنہ ہجرت واجب ہو؛ اسی لئے ماوردی نے کہا ہے کہ اگر غیر مسلم ممالک میں سے کسی ملک میں دین کو ظاہر کرنے پر قادر ہو تو اس کی وجہ سے وہ ملک دارالاسلام بن جاتا ہے، وہاں اس کا قیام کرنا ہجرت کرنے سے افضل ہے؛ کیوں کہ اس کی وجہ سے دوسروں کے اسلام میں آنے کی اُمید ہے۔

خود امام شافعیؒ نے 'کتاب الام' میں ہجرت کے سلسلے میں جو وضاحت کی ہے، وہ اس طرح ہے :

ودلت سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم علی ان فرض الهجرة علی من اطاقها ، إنما هو علی من فتن عن دینه بالبلد الذی یسلم بها ؛ لان رسول الله صلی الله علیه وسلم أذن لقوم بمکة أن یقیموا بها بعد اسلامهم العباس بن عبد المطلب وغیره اذا لم یخافوا

(۱) فتح الباری:۲۷۰/۷،کتاب مناقب الانصار

الفتنة و كان يامر جيوشه الى ان يقولوا لمن اسلم : ان هاجرتم ، فلكم ماللمهاجرين وان اقمتم فانتم كاعراب وليس يخيرهم فيما لا يحل لهم . (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہجرت کی فرضیت ان لوگوں پر ہے، جو اس کی طاقت رکھتے ہوں، جو اپنے دین کے سلسلہ میں کسی شہر میں ابتلاء سے دوچار ہو، اس کے لئے ایسی جگہ ہجرت فرض ہے، جہاں وہ اپنے دین کو بچا سکے؛ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے کچھ لوگوں —— حضرت عباس بن عبد المطلب وغیرہ —— کو مکہ میں قیام کی اجازت دی، جن کو فتنہ کا اندیشہ نہیں تھا اور آپ فوج کو اسلام قبول کرنے والوں سے یہ کہنے کی ہدایت فرماتے تھے کہ اگر تم ہجرت کرو گے تو تم کو وہی حقوق حاصل ہوں گے، جو دوسرے مہاجرین کو ہیں اور اگر تم اپنی جگہ ہی پر رہو گے تو دیہات والوں کی طرح شمار کئے جاؤ گے اور آپ ایسی بات کا اختیار نہیں دے سکتے تھے جو جائز نہ ہو۔

نیز مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے علامہ شوکانیؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے :

وقد حكى فى البحر : ان الهجرة عن دار الكفر واجبة اجماعاً حيث حمل على معصية فعل او ترك او طلبها الامام تقوية للسطانه . (۲)

البحر الرائق میں نقل کیا گیا ہے کہ دارالکفر سے اس وقت بالاتفاق ہجرت کرنا واجب ہے، جب کہ اس کو کسی کام کے

(۱) اعلاء السنن:۱۶۶/۱۲،من جامع المشرک وسکن معه فانه مثله

(۲) اعلاء السنن:۱۶۶/۱۲

کرنے یا نہ کرنے میں گناہ پر مجبور کیا جائے یا امام المسلمین
نے اس کو اپنی تقویت کے لئے طلب کیا ہو۔

تیسری بات جو قرآن مجید کی مذکورہ آیات سے صراحتاً ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ لوگ ہجرت کرنے پر قادر بھی ہوں، جو لوگ ہجرت پر قادر ہی نہ ہوں، ظاہر ہے کہ ان پر ہجرت واجب ہی نہیں ہوگی :

لاَ يُكَلِّفُ اللهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا . (۱)

اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کی وسعت کے بقدر ہی مکلّف بناتا ہے۔

پہلے زمانہ میں لوگوں کے لئے دشمنوں کے درمیان سے نکلنے کا مسئلہ دشوار تھا، اپنے ہم فکر لوگوں کے درمیان بسنے کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں تھا؛ کیوں کہ آج کی طرح ویزا اور پاسپورٹ کا لزوم نہیں تھا، لوگ اپنی مرضی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا کرتے تھے، موجودہ دور میں ہجرت پر قادر ہونا اس وقت متحقق ہوگا، جب کہ وہ اپنے وطن سے نکلنے پر بھی قادر ہو اور کسی مسلمان ملک کی پناہ حاصل ہونے کا بھی اسے یقین ہو، اگر دوسرے ممالک اسے پناہ دینے اور اپنے یہاں اسے اقامت کا حق دینے کو تیار نہیں ہوں، تو وہ بھی ہجرت سے عاجز سمجھے جائیں گے۔

چنانچہ علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ (م: ۶۲۰ھ) نے ہجرت سے متعلق مسلمانوں کے مختلف احوال اور قرآن وحدیث سے مستنبط ہونے والے احکام کو سامنے رکھ کر تین صورتیں بتائی ہیں :

فالناس فی الهجرة علی ثلاثة اضرب : احدها : من تجب علیه وهو من یقدر علیها ولا یمكنه اظهار دینه ، أولا تمكنه اقامة واجبات دینه مع المقام بین الكفار فهذا تجب علیه الهجرة ...... الثانی : من لا هجرة

---

(۱) البقرة:۲۸٦

علیـه وهـو من یعجز عنها إمـا لمرض أو اکـراه علی الاقـامة او ضـعف ، مـن الـنسـاء والولدان وشبههم ، فهذا لا هجرة علیه ...... ولا توصف باستحباب ، لأنها غیـر مـقـدور عـلیهـا ، والثـالـث : من تستحب له ولا تـجـب عـلیـه ، وهـو مـن یـقدر علیها لکنه یتمکن من اظهـار دینـه واقـامتـه فـی دار الـکفر ، فتستحب له ، لیتـمـکـن مـن جهـادهم وتکثیر المسلمین ومعونتهم ویتخلص من تکثیر الکفار ومخالطتهم ورویة المنکر بینهـم ولا تجب علیه لامکان اقامة واجب دینه بدون الهجرة ، وقـد کـان الـعبـاس عم النبی صلی الله علیه وسـلم مقیما بمکة مع اسلامه ، وروینا ان نعیم النحام حیـن اراد أن یهـاجـر جـاء ه قومه بنو عدی ، فقالوا له : أقـم عندنا ، وأنـت عـلی دینک ونحن نمنعک ممن یریدأ ذاک واکفنا ماکنت تکفینا ، وکان یقوم بیتامیٰ بـنـی عـدی وارامـلهـم ، فتـخـلف عن الهجرة مدة ثم هاجر بعد . (۱)

ہجرت کے حکم کے اعتبار سے لوگوں کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ جن پر ہجرت واجب ہے، یہ وہ ہیں جو ہجرت کرنے پر قادر ہوں، ان کے لئے اپنے دین کو ظاہر کرنا ممکن نہ ہو یا غیر مسلموں کے درمیان وہ اپنے دینی واجبات کو ادا نہیں کر سکتے ہوں، ان پر ہجرت واجب ہے...... دوسرے: وہ لوگ ہیں جن پر ہجرت واجب نہیں اور یہ وہ ہیں جو بیماری، وہیں مقیم

(۱) ملخصاً من المغنی:۱۳/۱۵۱-۱۵۲

رہنے پر مجبور کیئے جانے یا ضعیف ہونے کی وجہ سے ہجرت کرنے سے عاجز ہوں ، یعنی عورتیں ، بچے وغیرہ ، ان پر ہجرت واجب نہیں ...... اور ان کے لئے مستحب بھی نہیں ؛ کیوں کہ وہ اس پر قادر نہیں ہیں، تیسرے: وہ لوگ ہیں جن کے لئے ہجرت کرنا مستحب ہے، واجب نہیں، ...... اور یہ وہ لوگ ہیں جو ہجرت کرنے پر قادر تو ہیں ؛ لیکن ان کے لئے دارالکفر میں اپنے دین کو ظاہر کرنا اور مقیم رہنا ممکن ہے، تو ان کے لئے ہجرت مستحب ہے ؛ تاکہ جہاد کرسکیں ، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کرسکیں ، ان کی مدد کرسکیں ، غیر مسلموں کی اکثریت اور ان کے ساتھ رہن سہن سے بچ سکیں اور ان کے درمیان رہتے ہوئے خلافِ شرع باتوں کو دیکھنا نہ پڑے ؛ البتہ ہجرت واجب نہیں ہے ؛ اس لئے کہ وہ ہجرت کے بغیر بھی اپنے دینی واجبات کو ادا کرسکتے ہیں ؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ مسلمان ہونے کے باوجود مکہ میں مقیم تھے اور ہم نقل کر چکے ہیں کہ نعیم نحام نے جب ہجرت کرنا چاہا تو ان کی قوم بنو عدی کے لوگ آگئے کہ تم اپنے دین پر رہتے ہوئے یہیں قیام کرو، جو تم کو تکلیف پہنچانا چاہے گا ، ہم اس سے تمہاری حفاظت کریں گے اور جو حسن سلوک تم کرتے تھے، وہ کرتے رہو؛ کیوں کہ وہ بنو عدی کے یتیموں اور بیواؤں کی ضرورتیں پوری فرماتے تھے ؛ چنانچہ ایک مدت تک وہ ہجرت سے رکے رہے، پھر بعد میں ہجرت کی ۔

موجودہ دور میں جو مسلمان غیر مسلم ممالک کے زیر حکومت ہیں، ان کے سلسلے میں دو

نکات قابل توجہ ہیں: اول یہ کہ آج کل زیادہ تر ملکوں میں جمہوری نظام قائم ہے، جس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ مذہب لوگوں کا نجی معاملہ ہے اور ہر گروہ کو اپنے عقیدہ اور اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے کی گنجائش ہے، دنیا کے اکثر ممالک وہ ہیں، جنھوں نے انسانی حقوق کے بین الاقوامی چارٹ کو قبول کیا ہے اور اس بنیاد پر وہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرنے پر پابند ہیں؛ بلکہ بہت سے غیر مسلم اکثریت ممالک وہ ہیں، جہاں دعوتِ دین کے وسیع مواقع ہیں اور مسلمان اقلیتوں کی کوششوں سے اسلام دوسرا بڑا مذہب بن چکا ہے اور عام طور پر مسلمانوں کو اپنی جان و مال اور عزت وآبرو کے معاملہ میں قانونی تحفظ حاصل ہے؛ بلکہ بہت سے مسلمان، مسلم ممالک سے زیادہ ان ملکوں میں اپنے لئے امن وعافیت محسوس کرتے ہیں، ظاہر کہ ان حالات میں مسلمانوں کے لئے وہاں سے ہجرت کرنا واجب نہیں؛ بلکہ اگر وہ داعیانہ جذبہ کے ساتھ وہاں مقیم رہیں، تو علامہ ماوردی کے بہ قول ان کا اسی ملک میں مقیم رہنا مستحب ہے —— دوسرا قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ مغرب نے مسلمانوں کے درمیان کچھ اس طرح قومیت کا فتنہ اُبھارا ہے، نیز نسلی، لسانی اور جغرافیائی عصبیتوں کو جنم دیا ہے کہ اب مسلمان اپنے اپنے علاقوں کی سرحدوں کو خدا کی طرف سے کھینچی ہوئی لکیر تصور کرنے لگے ہیں اور اسلامی اخوت کا جذبہ کمزور پڑ گیا ہے، ان حالات میں غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے لئے یہ بات ممکن نہیں ہے کہ وہ مسلم ممالک کی طرف ہجرت کرسکیں؛ لہٰذا موجودہ دور میں علی العموم مسلمان اقلیتیں ہجرت کا راستہ اختیار نہیں کرسکتیں۔

دعوتِ دین —— واحد راستہ

تیسرا راستہ جو مسلمان اقلیتوں کے لئے موجودہ حالات میں واحد راستہ ہے، وہ ہے دعوتِ دین اور تبلیغ اسلام کا راستہ، ظاہر ہے کہ اس کے لئے زمان ومکان کی کوئی قید نہیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ عہد نے دعوت کے وسیع مواقع پیدا کردیئے ہیں اور خاص طور پر مسلمانوں کے لئے اسلام کی تبلیغ واشاعت کا نیا راستہ کھل گیا ہے، اس سلسلے میں

چند نکات خاص طور پر قابل توجہ ہے :

۱- آج دنیا کے تقریباً سبھی ممالک میں تبلیغ مذہب کی آزادی کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے اور ایسی جمہوریت کو آئیڈیل نظام حکومت مانا گیا ہے، جس میں عوام کو کسی ایک مذہب پر قائم رکھنے کا پابند نہیں بنایا جاتا ہو، اس کے برخلاف آج سے چند صدی پیشتر حکومتوں کا مذہب متعین ہوتا تھا، اس کے مقابلے میں کسی اور مذہب کے تبلیغ کی اجازت نہیں دی جاتی تھی، ــــ اس کی وجہ سے مسلمان اقلیتوں کے لئے غیر مسلم ممالک میں دعوتِ دین کی بڑی گنجائش پیدا ہوگئی ہے، چنانچہ افریقہ کے بہت سے ملکوں میں مسلمان اکثریت بن چکے ہیں، امریکہ، برطانیہ، فرانس اور متعدد مغربی ملکوں میں آج اسلام دوسرا بڑا مذہب ہے، ہندوستان میں خاطر خواہ کوشش نہ ہونے کے باوجود اسلام قبول کرنے کی رفتار خاصی تیز ہے اور ان کی آبادی حقیقی معنوں میں بیس فیصد اور سرکاری اعداد وشمار کے مطابق چودہ فیصد ہے۔

۲- تعلیمی ترقی کی وجہ سے لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا ہے، پہلے لوگ مذہب کے بارے میں زیادہ غور وفکر سے کام نہیں لیتے تھے اور بغیر سمجھے بوجھے اپنے مذہب پر جمے رہتے تھے، اب ہر چیز کو عقل ودانش کی کسوٹی پر پرکھنے کا مزاج پیدا ہوا ہے؛ اس لئے نئی نسل کھلے ذہن کے ساتھ مذاہب کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے، اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتی ہے، یہ چیز انھیں اسلام کی طرف لا رہی ہے۔

۳- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگوں کو آپ ﷺ سے دور رکھنے کے لئے زبردست پیروپیگنڈہ مہم چلائی گئی تھی اور آپ ﷺ کو بدنام کرنے کے لئے ــــ نعوذ باللہ ــــ آپ ﷺ کے دشمن آپ ﷺ کو ''محمد'' (قابل تعریف) کے بجائے ''مذمم'' (قابل مذمت) کہتے تھے اور لوگوں کو آپ ﷺ کی ملاقات سے منع کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تجسس بڑھ گیا اور یہی تجسس بہت سے لوگوں کے لئے قبول اسلام کا سبب بنا، اس وقت بھی عالمی سطح پر یہی صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے، صہیونی اور صلیبی طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے

لئے پوری دنیامیں پروپیگنڈہ مہم چلا رہی ہے اور اس کے لئے ترقی یافتہ ذرائع ابلاغ کا بھرپور استعمال بھی کررہی ہے، اس سے جہاں ایک طرف اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں، وہیں دوسری طرف اسلام کو سمجھنے اور قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کی ایک عام سوچ پوری دنیا کی سطح پر اُبھری ہے اور اس طرح بہت سے لوگ ہیں کہ جن پر کسی نے اسلام کی دعوت پیش نہیں کی؛ لیکن اسلام کا مطالعہ انھیں دامن اسلام میں لے آیا ہے اور ۱۱ رستمبر کے واقعہ کے بعد خاص طور پر لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے مغرب میں اسلام قبول کیا ہے۔

۴- اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام دین فطرت ہے، اس کی تعلیمات عقل ومشاہدہ اور فطرتِ انسانی سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں؛ اسی لئے اس میں ہر عہد کے مسائل کے حل کرنے کی پوری پوری صلاحیت ہے، دنیا کے دوسرے مذاہب چوں کہ انسانی آمیزش سے محفوظ نہیں رہ سکے؛ اس لئے ان کی بہت سی تعلیمات فطرتِ انسانی سے متصادم اور عقل ومشاہدہ کے خلاف ہیں، یہ وہ چیز ہے، جو لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچتی اور اس کی عظمت کا قائل بناتی ہے۔

۵- آج دنیامیں جتنے مذاہب ہیں، ان میں کوئی نہیں، جو انسانی مساوات وبرابری کے سلسلے میں انصاف کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہو، بائبل اسرائیلی اور غیر اسرائیلی میں فرق کرتی ہے، ہندو مذہب میں پیدائشی اونچ نیچ کا نہایت گہرا اور غیر منصفانہ تصور موجود ہے، گو سفید فام اور سیاہ فام لوگوں کے درمیان تفریق قانونی طور پر قریب قریب پوری دنیا سے ختم کردی گئی ہے؛ لیکن غیر معلنہ طور پر عملاً ابھی بھی یہ تفریق موجود ہے، اسلام ایسا دینِ عدل ہے، جس میں رنگ ونسل اور زبان وعلاقہ کے بنا پر کوئی تفریق نہیں ہے؛ بلکہ کرامت وشرافت کی بنیاد تقویٰ ہے "**لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لأسود علی احمر الا بالتقویٰ إن أکرمکم عند اللہ اتقاکم**"(۱)

(۱) شعب الایمان للبیھقی، حدیث نمبر:۵۱۳۷

—— اس کی وجہ سے افریقی اور مغربی ممالک میں سیاہ فام لوگ اور ہندوستان میں پسماندہ اقوام کا اسلام کی طرف زبردست رجحان پایا جاتا ہے اور اگر سنجیدہ کوشش کی جائے ، تو اس کے گہرے اور مفید اثرات مرتب ہو سکتے ہیں ۔

۶- اسلام سے متاثر ہونے کا ایک اہم سبب قانونِ شریعت کا اعتدال بھی ہے، دنیا کے دو بڑے مذاہب ہندومت اور عیسائیت میں طلاق، خلع اور بیوہ و مطلقہ عورتوں کے نکاح کا کوئی تصور نہیں تھا، بیشتر مذاہب میں عورتوں کو میراث نہیں دی جاتی تھی، اسی طرح لڑکیاں اپنی مرضی سے رشتہ کا انتخاب نہیں کرسکتی تھیں ؛ بلکہ ان کے والدین ان پر اپنی مرضی مسلط کرنے میں حق بہ جانب سمجھے جاتے تھے، دوسری طرف موجودہ مغربی تہذیب نے آزادی کے نام پر عورتوں کو گھر سے باہر نکالا اور وہ ذمہ داریاں بھی ان سے متعلق کر دیں، جو فطرت نے مردوں پر رکھی تھیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندانی نظام بکھر گیا، طلاق کی شرح بڑھ گئی، نکاح کی شرح کم ہوگئی اور شرحِ پیدائش میں ایسا انحطاط آگیا کہ مغرب کی بعض نسلیں ختم ہونے کے قریب ہیں ۔

اس کے برخلاف شریعت اسلامی افراط وتفریط سے پاک اور اعتدال پر مبنی ہے، جس میں مردوں اور عورتوں ، آجرین اور مزدوروں کے حقوق نہایت انصاف کے ساتھ متعین کئے گئے ہیں ، جس میں مرد اور خواتین دونوں کو پرسکون زندگی حاصل ہوتی ہے، اسلامی تعلیمات کا یہ پہلو خاص کر خواتین کو بہت متاثر کرتا ہے اور اسی لئے اس وقت دنیا میں عورتوں کے اسلام قبول کرنے کا تناسب مردوں سے زیادہ ہے ۔

ظاہر ہے اسلام کی یہ خصوصیات اول روز سے ہیں ؛ لیکن موجودہ دور کے سیاسی نظام اور ذرائع ابلاغ کی ترقی نے اسلام کے ان امتیازی پہلوؤں کو برادرانِ انسانیت تک پہنچانا آسان کر دیا ہے ؛ اس لئے ضرورت ہے کہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں یا کسی وجہ سے غیر مسلم حکومتوں کے زیر سایہ زندگی گزار رہے ہیں ، وہاں اصل توجہ دعوتِ دین پر دی جائے ، تو انشاءاللہ انھیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد : ''بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا

بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ"(۱) کے مطابق دوسری اقوام سے تحفظ بھی حاصل ہوگا، اسلام کی اشاعت بھی ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ بتدریج وہ اس ملک کی غالب طاقت بن جائیں، جیسا کہ ملیشیا، انڈونیشیا اور بعض دوسرے ملکوں میں ہوا۔

دعوتِ دین اور عالم اسلام کی ذمہ داری

دعوتِ دین کے سلسلے میں عالم اسلام کی حکومتوں اور عوام کی بھی بڑی ذمہ داریاں ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ عالم اسلام کے پاس بہترین قدرتی وسائل ہیں، ان کا فریضہ ہے کہ وہ ان وسائل سے ایک طرف اپنے ملک کی غیر مسلم اقلیت اور غیر مسلم تارکین وطن میں دعوت کا کام کریں اور اسلام قبول کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں، دوسری طرف غیر مسلم ممالک کی مسلمان اقلیت کا اس کام کے لئے فراخدلانہ تعاون کریں؛ تاکہ وہاں خدمت خلق کے ادارے قائم کئے جاسکیں، درسگاہیں قائم ہوں، نیز براہ راست اور بالواسطہ دعوت کے کام کو فروغ حاصل ہو، حقیقت یہ ہے کہ جن غیر مسلم ممالک میں مذہبی آزادی حاصل ہے اور جس کی بنیاد سیکولرزم پر ہے، وہاں اگر مسلمانوں کی مالی مدد کی جائے اور ان کی دعوتی کوششوں کی حوصلہ افزائی ہو تو اسلام کی اشاعت کا نمایاں کام ہوسکتا ہے۔

مسلم ممالک کو اس سلسلہ میں عیسائی دنیا کی مثال سامنے رکھنی چاہئے، عیسائی ممالک کی حکومتیں، وہاں کے اہل ثروت اور وہاں کے خیراتی ادارے عیسائی مشنریز کا بے حد تعاون کرتے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان —— جس کے طول وعرض میں عیسائیوں کا کوئی وجود نہیں تھا، —— کی کم سے کم چار ریاستیں عیسائی اکثریت ریاستوں میں تبدیل ہوچکی ہیں اور متعدد ریاستوں میں عیسائیوں کی آبادی اس مقام پر پہنچ گئی ہے کہ ان کی سیاسی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس کا بنیادی سبب خدمت خلق، غریب بچوں کے لئے مفت تعلیم کا انتظام اور مشنریز کے ان کاموں کے لئے مغربی ملکوں کی طرف سے بیش قیمت

---

(۱) المائدة:٦٧

اعانتوں کی فراہمی ہے، اس لئے عالم اسلام کو اس سلسلے میں سوچنا چاہئے اور مشترک طور پر اس کے لئے منصوبہ بندی کرنی چاہئے۔

دعوت کس بات کی دی جائے؟

دعوت کے سلسلے میں ایک اہم اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ دعوت کس بات کی دی جائے؟ افسوس کہ ہمارے زمانہ میں لوگوں نے دین کی دعوت دینے کے بجائے اپنے اپنے مسلک کی دعوت دینی شروع کر دی ہے، بعض فروعی مسائل کی تبلیغ کرتے ہیں اور اسی کو تبلیغ دین سمجھتے ہیں، حالاں کہ دعوت تو اُصولِ دین کی ہے، جیسے: توحید، رسالت، آخرت، قرآن پر ایمان، اقامتِ صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ وغیرہ؛ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فروعی مسائل پر بیعت نہیں لیتے تھے؛ بلکہ ایمانیات اور بنیادی فرائض ومحرمات کے سلسلے میں بیعت لیا کرتے تھے، اس سلسلہ میں کثرت سے احادیث مروی ہیں، یہاں ان کا ذکر طولِ کلام کا باعث ہوگا، اسی طرح قرآن مجید میں جہاں بھی انبیاء کی دعوت کا ذکر ہے، اس میں توحید، شرک اور بعض مسلّمہ برائیوں سے اجتناب کی تلقین کی گئی ہے۔

غیر مسلموں میں دعوت

دوسرا قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں میں اصلاح وارشاد کا جو کام ہو رہا ہے، بہت سے لوگوں نے فریضۂ دعوت کی ادائیگی کے لئے اس کو کافی سمجھ لیا ہے، یہ بھی بنیادی غلط فہمی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو عقیدہ وعمل کے انحراف سے بچائے، یہ بھی فی الجملہ دعوتِ دین میں شامل ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات سے بھی عمل صالح کی بیعت لی ہے، جو پہلے سے مسلمان تھے، خود مسلمانوں کو ایمان پر استقامت کی دعوت دیتے ہوئے کہا گیا: ''یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اٰمِنُو''(۱) قرآن مجید نے مسلمانوں کو آپس میں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے:

---

(۱) النساء:۱۳۶

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ، يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ، اُوْلٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ، اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ . (۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی، یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔

لیکن یہ سمجھنا کہ فریضۂ دعوت کو ادا کرنے کے لئے یہی کافی ہے، قطعاً درست نہیں، حقیقت یہ ہے کہ دعوتِ دین کے اصل مخاطب کفار و مشرکین ہیں؛ کیوں کہ :

(الف) قرآن مجید میں جن انبیاء اور ان کی اقوام کا ذکر آیا ہے، اگر ان کا مطالعہ کیا جائے اور قرآن میں انبیاء اور ان کی اقوام کے جو مکالمات مذکور ہیں، ان کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسی فیصد سے بھی زیادہ ان کے مخاطب ان کے عہد کے کفار و مشرکین تھے۔

(ب) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ۲۳ سالہ عہدِ نبوت میں ابتداء نبوت سے فتح مکہ بلکہ حجۃ الوداع تک مشرک قبائل ہی میں دعوتی کوششیں فرمائیں۔

(ج) اگر ایک شخص کی بیماری معمولی ہو اور دوسرا شخص زیادہ بیمار ہو، تو فطری طور پر انسان پہلے زیادہ بیمار شخص کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یقیناً کفر کی بیماری فسق عملی سے کہیں بڑھ کر ہے؛ کیوں کہ کافر کتنے بھی اچھے عمل کرے، وہ دوزخ سے بچ نہیں سکتا اور مومن کے اعمال کتنے بھی خراب ہوں، وہ انجام کار انشاء اللہ جنت میں داخل ہوگا۔

---

(۱) التوبہ:۷۱

(د) قرآن مجید میں بہت سے مواقع پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے اور سب سے بڑا معروف ''ایمان باللہ'' ہے اور سب سے بڑا منکر ''کفر وشرک''؛ اسی لئے بعض اہل علم کے نزدیک تو قرآن میں جہاں بھی معروف کا لفظ کہا جائے، وہاں ایمان مراد ہوتا ہے اور جہاں بھی منکر کا ذکر آئے، وہاں اس سے کفر مراد لیا جاتا ہے؛ چنانچہ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں :

قوله تعالىٰ " يامرون بالمعروف " اى بعبادة الله وتوحيده وكل ما اتبع ذلك : " وينهون عن المنكر " عن عبادة الاوثان وكل ما اتبع ذلك ، وذكر الطبرى عن ابى العاليه انه قال كل ما ذكر لله فى القرآن من الامر بالمعروف والنهى عن المنكر ، فهو النهى عن عبادة الاوثان والشياطين . (۱)

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''یامرون بالمعروف'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی عبادت، توحید اور جو باتیں اس کے تابع ہیں، اس کا حکم دیتے ہیں اور ''ینھون عن المنکر'' سے مراد یہ ہے کہ بتوں کی پرستش وغیرہ سے منع کرتے ہیں اور طبری نے ابوالعالیہ سے نقل کیا ہے کہ قرآن میں جہاں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم ہے، بتوں اور شیطانوں کی پوجا سے روکنا ہی مقصود ہے۔

لہٰذا جن اُمور کی دعوت دی جائے، ان میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، ایک یہ کہ دعوت اُصولِ دین کی طرف دی جائے، اپنے مذہب ومسلک کی طرف نہیں، دوسرے: دعوتِ دین کے اصل مخاطب وہ لوگ ہیں، جو ابھی دامن اسلام میں نہیں آئے ہیں، مسلمانوں میں دعوت کو فریضۂ دعوت کی ادائیگی کے لئے کافی نہیں سمجھا جائے۔

اس سلسلہ میں ممتاز صاحبِ علم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا

---

(۱) تفسیر طبری: ۲۰۳/۸

ایک اقتباس نقل کرنا مناسب ہوگا :

تبلیغ تو اصل میں اسے ہی کہیں گے، جس کو آپ پوچھ رہے ہیں، تبلیغ احکام حقیقتاً تبلیغ نہیں ہے، اسے مجازاً تبلیغ کہا جاتا ہے، حقیقت میں تبلیغ اس کا نام ہے کہ غیر مسلموں کو دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی جائے۔(۱)

بعض حضرات نے 'الحال' غیر مسلموں میں دعوت کے کام کو ضروری نہیں سمجھتے، اس کے مقابلہ میں مسلمانوں میں دعوت کے کام کو ضروری یا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں، ان کی طرف سے دو باتیں خاص طور پر کہی جاتی ہیں، اول: یہ کہ اصل مسلمانوں کے اعمال کا درست ہونا ہے، ان کے اعمال درست ہوگئے تو خود بہ خود غیر مسلم دامن اسلام میں آنے لگیں گے، دوسرے: ''عبس وتولیٰ '' والی آیت سے استدلال کیا جاتا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مکتوم رضی اللہ عنہ کی طرف سے رُخ موڑ کر روٴساء قریش کی طرف توجہ کی تو اللہ کی طرف سے عتاب آ گیا، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر غیر مسلموں میں دعوت کا کام کرنا مناسب نہیں۔

مگر یہ دونوں باتیں محض غلط فہمی پر مبنی ہیں، پہلی بات اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اشاعت دین کے لئے بنیادی طور پر دعوت کا حکم دیا ہے نہ کہ صرف اپنے اعمال کی اصلاح کا، چنانچہ ارشاد ہے: ''كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ''(۲) اگر دعوت ضروری نہ ہوتی اور مسلمانوں کا اپنے اعمال کی اصلاح کر لینا کافی ہوتا تو اسی کا حکم دیا گیا ہوتا، دوسرے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے بڑھ کر اعمالِ صالحہ کس کے ہوسکتے ہیں، مگر اس کے باوجود اشاعت اسلام کے لئے یہ بات کافی نہ ہوسکی؛ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ نے سخت دعوتی جدوجہد فرمائی

(۱) دو اہم مسئلے، یعنی تبلیغ کی اہمیت اور تبلیغ سے تعلیم کا جوڑ: ۴۸، ناشر: مدرسہ تعلیم القرآن لپڑی، جونپور: ۱۴۱۵ھ

(۲) آلِ عمران: ۱۱۰

اور اس راستہ میں نا قابل بیان مشقتیں اور تکلیفیں اُٹھائیں ، تب جا کر اسلام پھیل سکا ، اس سے معلوم ہوا کہ صرف مسلمانوں کے اعمال کا درست ہوجانا اشاعت اسلام کے لئے کافی نہیں ؛ بلکہ باضابطہ دعوت وتبلیغ ضروری ہے، جیسا کہ انبیاء کرام کرتے رہے ہیں۔

دوسری بات اس لئے غلط ہے کہ قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کی بجائے غیر مسلموں میں دعوتی کوشش پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ہوا ہے ، اصل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ غلام بھی تھے اور نابینا بھی ، مادہ پرست لوگ ایسے افراد کو حقیر سمجھتے ہی ہیں ، رؤساء قریش ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کو اپنے جھوٹے وقار کے خلاف سمجھتے تھے ، جب رؤساء قریش سے گفتگو کے درمیان صحابی رسول نے ایک سوال کر دیا اور رؤساء قریش نے کہا کہ اسی لئے ہم لوگ آپ کی بات سننا نہیں چاہتے ، تو آپ کو خیال ہوا کہ کاش ! ابھی یہ سوال نہ کرتے تو ہوسکتا تھا کہ یہ گمراہ لوگ میری بات سن کر دامن اسلام میں آجاتے ، اس لئے آپ کو کچھ نا گواری ہوئی ، اسی پر اللہ کی طرف سے تنبیہ کی گئی ، اس کا منشاء صرف یہ ہے کہ کوئی شخص معذور ہو ، دنیوی اعتبار سے جاہ ومرتبہ نہ رکھتا ہو تو اس سے بے رُخی کے ساتھ پیش نہ آنا چاہئے ؛ کیوں کہ اللہ کے یہاں انسان کی عزت اس کے اعمال سے ہے نہ کہ ظاہری شوکت وحشمت سے ، ظاہر ہے اس آیت میں مسلمانوں کے بجائے غیر مسلموں میں دعوت کے کام سے ممانعت کا دور دور تک کوئی ذکر نہیں اور اگر اس کا یہی منشاء ہوتا تو اس واقعہ کے بعد آپ مشرکین واہل کتاب میں دعوت کی جد وجہد چھوڑ کر صرف ان صحابہ کی تربیت میں یکسو ہوجاتے جو مسلمان ہو چکے تھے ، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک ایسا نہیں ہوا۔

دعوت کے وسائل اور عصر حاضر

یہ بات بھی اہم ہے کہ دعوت دین کے لئے موجودہ دور میں کن وسائل کو اختیار کیا جائے ؟ —— اس سلسلہ میں چند اُمور قابل ذکر ہیں :

(الف) سب سے اہم کام مبلغین کی تیاری کا ہے ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر جو صحابی ایمان لاتے ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں ایک داعی کی حرارت پیدا کر دیتے ؛ اسی لئے ہم

دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایمان لائے اور فوراً انھوں نے اپنے حلقۂ احباب میں دعوت ِدین کا کام شروع کر دیا اور کئی لوگ ان کی کوششوں سے ایمان لائے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، تو بہت سے لوگوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، بعض دفعہ ایسا ہوا کہ قبیلہ کا ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مسلمان ہوا اور اس کی کوششوں سے پورا قبیلہ اسلام کی آغوش میں آ گیا۔

یہ اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے افراد سازی کی زبردست کوشش کا نتیجہ تھا، آج بھی دعوتِ اسلام کے لئے سب سے بڑی ضرورت دعاۃ کی تیاری ہے، جو لوگوں تک موجودہ زمانے کے اُسلوب میں، مخاطب کی استعداد کو سامنے رکھتے ہوئے سمجھانے اور اپنی بات پہنچانے کا ملکہ رکھتے ہوں۔

(ب) دوسرا ضروری کام دعوتی لٹریچر کی تیاری کا ہے، جس میں مخاطب کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کی جائے، بحمد اللہ اس سلسلہ میں حکومتی، جماعتی اور انفرادی سطح پر عالم اسلام، برصغیر اور مغربی ممالک میں نمایاں کام ہوا ہے؛ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اسے دنیا کی مختلف زبانوں میں لوگوں تک پہنچائیں، اللہ کا شکر ہے کہ دنیا کی بہت سی زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ ہوا ہے اور اس سلسلے میں ''مجمع الملک فہد مدینہ منورہ'' کی خدمات بہت نمایاں ہے؛ لیکن ابھی بھی بہت سی زبانیں ہیں، جن میں قرآن مجید کا ترجمہ نہیں ہو پایا ہے، عالم اسلام کو خاص طور پر اس جانب توجہ کرنی چاہئے، ایک محقق کے بیان کے مطابق بہ حیثیت مجموعی دو سو دس زبانوں میں پورے قرآن یا اس کے کچھ حصہ کا ترجمہ ہو چکا ہے؛ لیکن یہ تعداد ہمیں بہت حقیر معلوم ہوتی ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ بائبل کا ترجمہ اٹھارہ سو زبانوں میں ہو چکا ہے، یہ یقیناً مسلمانوں کے لئے مایۂ عبرت ہے!

(ج) اس دور میں الکٹرانک ذرائع ابلاغ نے جس تیزی سے اپنے پَر پھیلائے ہیں، وہ محتاج اظہار نہیں، اپنے کمرے کی تنہائی میں بیٹھ کر ایک شخص پوری دنیا تک اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے، انٹرنیٹ، الکٹرانک ذرائع ابلاغ اور ٹی وی چینل اس وقت تبلیغ کا نہایت مؤثر

ذریعہ ہے، باطل ادیان اور مخالف اسلام عناصران طاقتوں کا بھرپور استعمال کررہے ہیں، مگر اسلام کی نشر واشاعت کے لئے ان وسائل کا استعمال نہایت معمولی سطح پر ہوتا ہے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مختلف ملکوں اور علاقوں کی زبانوں میں دعوتِ اسلام کی غرض سے چینل قائم کئے جائیں اور انھیں شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے دلچسپ اور پُرکشش بنا کر پیش کیا جائے، اگر مسلمان حکومتیں اور مسلمان اصحابِ ثروت اس پر توجہ دیں، تو یہ چنداں دشوار نہیں۔

(د) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں تیرہ سال گذارے اور اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد چند سو سے آگے نہیں بڑھ سکی، صلح حدیبیہ کے موقع سے آپ ﷺ کے ساتھ چودہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم تھے، جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی کل آبادی دو تا تین ہزار رہی ہوگی، اس موقع پر قریش نے ہٹ دھرمی کا رویہ اختیار کیا اور آپ نے بہ ظاہر تنزل اختیار کرکے صلح فرمائی، اس صلح کی وجہ سے مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان معتدل تعلقات قائم ہوئے اور ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا شروع ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو سال بعد سن آٹھ ہجری میں جب مکہ فتح ہوا، تو مسلمانوں کا لشکر کم وبیش دس ہزار افراد پر مشتمل تھا اور اگلے دو سال میں یہ قافلہ بحرِ بےکران بن گیا، یہاں تک کہ حجۃ الوداع میں ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے ہم رکاب تھے۔

یہ اثر تھا دعوت اور اس کے لئے ماحول سازی کا، دعوت کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات میں ہم آہنگی ہو اور غیر مسلم ہماری بات سننے کی طرف مائل ہوسکیں، اگر ماحول میں ایسی نفرت ہو کہ ایک دوسرے کو دیکھنا بھی گوارا نہ ہو، تو ظاہر ہے دعوت نتیجہ خیز نہیں ہو پائے گی، اس لئے پوری دنیا میں مسلمانوں کو کوشش کرنی چاہئے کہ مقامی غیر مسلم آبادی سے ان کے تعلقات معتدل ہو، انسانی اُخوت کے جذبہ کو اُبھارا جائے اور بہتر سلوک کے ذریعے غیر مسلم بھائیوں کے دلوں کو جیتا جائے کہ اس کے بغیر دعوتِ دین کی جدوجہد سنگلاخ زمین میں بیج بونے کے مترادف ہوگی۔

☆ ☆ ☆ ☆